رابطۂ ادب اسلامی (عالمی) کا سہ ماہی اردو ترجمان

کاروانِ ادب اسلامی

زیر سرپرستی

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی دامت برکاتہم

مدیر مسؤل

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

ناشر

مرکزی دفتر رابطۂ ادب اسلامی (عالمی)

پوسٹ بکس نمبر ۹۳ ندوۃ العلماء لکھنؤ

کاروانِ ادب اسلامی

سرپرست اعلیٰ — مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (صدر رابطۂ ادب اسلامی (عالمی))

مجلس مشاورت —
مولانا محمد ناظم ندوی ———
پروفیسر عبداللہ عباس ندوی، مکہ مکرمہ — پروفیسر عبدالحلیم ندوی، دہلی
پروفیسر حبیب الحق ندوی، جنوبی افریقہ — پروفیسر ابوالخیر کشفی
پروفیسر ظہور احمد اظہر — پروفیسر تحسین فراقی
پروفیسر محمد راشد ندوی، علی گڑھ — مولانا محمد سلطان ذوق ندوی

مدیر مسئول — مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (ناظم شعبۂ برصغیر)

مجلس ادارت —
ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی۔ جے۔ این۔ یو دہلی
پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ندوی، بی۔ ایچ۔ یو۔ بنارس یونیورسٹی
مولانا نذرالحفیظ ندوی لکھنؤ

معاون انتظامی — اقبال احمد ندوی — کتابت:۔ حامد

معاون طباعت — محمد غفران ندوی — طباعت: لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس، لکھنؤ

زر تعاون

فی شمارہ	چالیس ۴۰ روپے
سالانہ برائے ہندوستان	ایک سو پچاس روپے
پاکستان و بنگلہ دیش	تین سو روپے یا دس امریکی ڈالر
ان کے علاوہ دیگر ممالک	چار سو روپے یا ۱۲ امریکی ڈالر
چیک یا ڈرافٹ اس نام سے بنائیں	RABITAT-AL-ADAB-AL-ISLAMI (INDIA)

پتہ :۔ صدر دفتر رابطہ ادب اسلامی (عالمی) پوسٹ بکس ۹۳ ندوۃ العلماء لکھنؤ

فہرست مضامین

جلد نمبر ۴ | اکتوبر ــــ دسمبر ۱۹۹۷ء | شمارہ نمبر ۳

۱۔ منزل بہ منزل — مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی — ۵

مقالات

۱۔ دعا میں وجدان واصول کی مطابقت — مولانا عبداللہ عباس ندوی — ۸

۲۔ حافظ ابراہیم کی عربی منظومات کے اردو نثری تراجم — ڈاکٹر سید وقار احمد رضوی — ۲۱

۳۔ اقبال اور ابوالعلاء معری: ایک تقابلی مطالعہ — ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی — ۳۴

۴۔ بال جبریل کی نظم "ذوق وشوق" ایک مطالعہ — محمد بدیع الزماں — ۴۲

۵۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے خطبات مقالات اوران کا ادب — محمد عبداللہ مغیثی — ۷۱

۶۔ شبلی کی سوانح نگاری ایک تجزیاتی مطالعہ — سرور عالم ندوی — ۸۱

۷۔ اکبر الہ آبادی کا مقام و مرتبہ	ڈاکٹر شمس تبریز خاں	۱۰۰
۸۔ ہمت دشوار پسند	ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی	۱۰۸
۹۔ مولانا آزاد بلگرامی اور عربی زبان و ادب میں ان کی خدمات	ڈاکٹر سید حسن عباس	۱۱۴
۱۰۔ عربی زبان کا مقام اور دوسری زبانوں میں اس کے اثرات	مولانا خطیب الرحمٰن ندوی	۱۳۱
۱۱۔ ہندوستان اور عربی نعت گوئی	اعجاز احمد	۱۴۱
۱۲۔ عربی زبان میں مواعظ کا ارتقاء ایک جائزہ	ڈاکٹر محمد صلاح الدین عمری	۱۶۱
۱۳۔ مولانا عبدالحی احقر بنگلوری وعظ کے مجتہد اعظم	ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی	۱۸۲

شعر و ادب

۱۔ نعت	ڈاکٹر طفیل احمد مدنی	۱۹۳
۲۔ نظم	رضوان اللہ فاروقی	۱۹۴

ادب اسلامی کی خبریں

۱۔ حرمین شریفین کے سفرناموں پر بین الاقوامی سیمینار کی روداد	ڈاکٹر محمود الحسن عارف	۱۹۶

مولانا محمد رابع حسنی ندوی

منزل بہ منزل

ادب انسان کی ایک ضرورت ہے، وہ اس کے فکر و احساس کے اظہار کو طاقت عطا کرتا ہے، ایسی طاقت جو اس اظہار کو مؤثر اور دلکش بنا دیتی ہے، ادب کے لیے اس بات میں فرق نہیں کہ انسان کا اپنے فکر و احساس کا یہ اظہار اپنے پیش نظر کسی اچھے مقصد کو رکھتا ہے، اور کسی اچھے پس منظر سے وابستہ ہے۔ یا کسی غیر انسانی مقصد کو پیش نظر رکھتا ہے، اور کسی مذموم پس منظر کا نتیجہ ہے، ادب دراصل نام ہے کسی اثر رکھنے والے مضمون کو اختیار کرنے اور اس کو مؤثر طرز کلام میں پیش کرنے کا۔ اور اثر رکھنے والے کسی مضمون کو اختیار کرنا اور اپنی بات کو حسن تعبیر کے ساتھ پیش کرنا ایسا عمل ہے جس کا پڑھنے اور سننے والا اگر صحیح ذوق سے محروم نہیں ہے تو ضرور متاثر ہوتا ہے چنانچہ ادبی صلاحیتوں کے حاملین نے اپنی ان صلاحیتوں سے اپنے مخاطبین کو خوب خوب متاثر کیا ہے، یہ تاثر کبھی کبھی بہت بڑھ جاتا ہے، مضمون کے انتخاب اور اس کے حسن ادا کی اثر پذیری نے ادب سے فائدہ اٹھانے والوں کو بعض بعض وقت اتنا مسحور کر دیا ہے کہ پس منظر میں کوئی خوبی ہے تو، اور کوئی خرابی ہے تو، اور اس کا مقصد تعمیری ہے تو، اور اگر تخریبی ہے تو وہ اس کے اس نفع و ضرر کا احساس نہیں کر سکے۔ دراصل ادب میں انسانی و اخلاقی خرابی یا خوبی کا منبع عموماً خود ادب نہیں ہوتا بلکہ ادب کی تخلیق کرنے والے کا ارادہ و عمل ہوتا ہے، خواہ ظاہراً اس خوبی یا خرابی کا انتساب ادب کی طرف ہی کیا جا رہا ہو۔ دراصل صاحب ادب کا خود اپنا ارادہ و عمل ہوتا ہے، جو اس کے انتخاب مضمون اور اس کو مخصوص طرز میں ادا کرنے کے اندر مخفی ہوتا ہے، غالباً اسی لیے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جاہلی شعراء کی مذموم شعر گوئی کے تذکرہ کے موقع پر ان کی شعر و شاعری کی مذمت کے بجائے خود شعراء کی مذمت کی، اور فرمایا:

وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ ۝ أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ ۝ وَأَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا - اس میں اولاً ان کے کلام سے متأثر اور ان پر فریفتہ ہوجانے والوں کے ان کے پیچھے دوڑنے والوں کی مذمت کی، پھر شعراء کا تذکرہ فرماتے ہوئے ذکر فرمایا کہ یہ بے مقصد ادھر ادھر مارے مارے پھرتے ہیں، اور وہ کہتے ہیں جس پر عمل نہیں کرتے، پھر شعراء کی اس قسم کو مستثنیٰ فرمایا جو ایمان و عمل کے صحیح تقاضوں کو پورا کرتے ہیں، اور اپنے پروردگار کو خوب یاد رکھتے ہیں، اور انھوں نے اپنے اوپر ہونے والی کسی زیادتی کا شکار ہوجانے پر ہی انتقامی رویہ اختیار کیا ہوتا ہے۔

اس طرح شاعری کے متعلق قرآن مجید میں دو تصور واضح کئے گئے، ایک تخریبی جو ایسی شاعری سے ابھرتا ہے جو بے مقصد وقت گذاری، آوارہ گردی اور بے راہ رو بھیڑ کی سربراہی کی صفت رکھتی ہے، اور دوسرا معقول اور قابل قبول جو ایسے شعراء کے کلام میں ملتا ہے جو ایمان اچھے عمل سے آراستہ ہوتے ہیں، اللہ کو خوب یاد کرتے ہیں، اور انتقامی یعنی ایذا رسانی کا رویہ اس وقت اختیار کرتے ہیں جب ان کے ساتھ ظلم ہوا ہو، یعنی جاہلیت کے طریقہ پر نہیں جس میں دنیاوی و مادی منفعت یا اپنی نفسانیت کی طلب پر بے گناہ اشخاص کی ہجو و اہانت کرتے تھے۔ اور اپنی منفعت کے لیے الزام تراشی و دروغ گوئی سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

ہم جب ادب کے ساتھ اسلامی کا لفظ وابستہ کرتے ہیں تو ہمارا اشارہ اسی طرف ہوتا ہے کہ ادب کو اس طرح تشکیل دیا گیا ہو کہ وہ انسانیت کے صاف ستھرے دائرے میں رہتے ہوئے کام کرتا ہو اور جس کے نتیجہ و اثر سے بگاڑ اور خرابی کا دروازہ نہ کھلتا ہو، بلکہ وہ انسان کو ستھرے راستہ پر چلنے میں معاون بنتا ہو، وہ جائز فکر و احساس کی عکاسی کرنے کی خدمت انجام دیتا ہو، ایسا ادب صرف اسلامی ادب ہی نہیں انسانی قدروں والا بھی ادب ہے، اس کو انسانی ادب کا بھی نام دیا جاسکتا ہے، صالح ادب بھی کہا جاسکتا ہے لیکن انسانی یا صالح کے لفظ سے اس کو متصف کرنے سے واضح تصور نہیں ابھرتا، کیونکہ انسانی اور صالح کے لفظ کے ساتھ وابستہ تصورات مختلف اور الگ الگ ہوسکتے ہیں۔

ان سے متعین وضاحت نہیں ہوتی۔ لیکن اسلامی سے واضح دائرۂ عمل اور واضح نقشہ ابھرتا ہے کیونکہ اسلام کی طرف سے جو وضاحت ہے وہ مخفی امر نہیں ہے، قرآن وحدیث اس کے لیے منارۂ ہدایت ہیں۔

ادب کا ہمارا اسلامی تصوّر مذکورہ بالا پابندی کے باوجود وسیع انسانی پہلوؤں پر محیط ہے، یہ زندگی کے مختلف النوع پہلوؤں سے تعلق رکھتا ہے اور انسان کی تمام ادبی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اس میں حسن انتخاب وحسن ادا کا پہلو بھی ہے، احساس وشعور کی ترجمانی کا سامان بھی ہے، فکر وجذبات کی غذا اور دوا بھی ہے، البتہ اس میں فسق وفجور، ظلم وزیادتی، نفس پرستی اور خدا بیزاری کا سامان نہیں ہے، ان کے علاوہ انسانی زندگی کے دیگر تمام پہلوؤں کا حق ادا کرنے کا سامان ہے، یہ انسان دوست، مخلصانہ اور دلکشی کا حامل ادب ہے، اور اسلامی کے لفظ سے اسی کی طرف اشارہ ہے۔

ادب ہم کو قرآن مجید کے نزول کے وقت سے ملنا شروع ہوا، خود قرآن مجید میں کلام بلیغ کے جو نمونے ملتے ہیں ان سے ادب کے مختلف النوع طرز اور مختلف مضامین زندگی کا پُراثر اظہار اور انسانی احساس وذہن کو متحرک کرنے اور تسکین دینے والے انداز ملتے ہیں پھر حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام بلاغت نظام میں ہمارے لیے بہت سامان ہے، پھر اس ڈگر کی پابندی کرتے ہوئے پندرہ سو سال میں ہزاروں شہ پارے اور انواع واقسام کے ادبی نمونے ظہور میں آئے وہ کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں، ایسے نمونوں کو ابھارنا اور ان کو روشنی میں لانا نیز اس ڈگر کو روشناس کرانا اور اس پر چلنے والوں کی ہمّت افزائی کرنا اور اس کام کو آگے بڑھانا ہمارے رابطہ ادب اسلامی کا کام ہے۔ ہمارا کاروانِ ادب اسی کی راہ پر منزل بہ منزل رواں ہے اور الحمد للہ اس کاروان کو نئے رفقاء سفر بھی ملتے جارہے ہیں۔

مولانا عبداللہ عباس ندوی

دعا میں وجدان واصول کی مطابقت

دعا عبدیت کا لازمہ اور فطرت کا تقاضہ ہے جسم جس طرح بغیر غذا کے قائم نہیں رہ سکتا روح بغیر دعا کے باقی نہیں رہ سکتی۔ وقال ربکم ادعونی استجب لکم اور تمہارے پروردگار نے کہا: مجھے پکارو میں تمہاری درخواست قبول کروں گا، کے معًا بعد اور اسی آیت کا جزو بلکہ تکملہ ہے۔

ان الذین یستکبرون عن عبادتی سیدخلون جہنم داخرین۔ جو لوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں ذلیل وخوار ہوکر داخل ہوں گے، جو بجائے خود اعلان ہے کہ دعا عبادت ہے اور اس سے اعراض استکبار ہے جس طرح آیت حج میں ہے۔ وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ اس گھر کا قصد کریں جو لوگ راستہ طے کرکے وہاں پہنچنے کی مقدرت نہ رکھتے ہوں، کا تکملہ ہے۔

ومن کفر فان اللہ غنی عن العالمین۔ اور جو کفر کرے تو سمجھ لے کہ اللہ سارے جہانوں سے بے نیاز ہے۔

جس کا واضح مفہوم یہی ہے کہ جس نے باوجود استطاعت کے اس حق کی ادائیگی میں کوتاہی کی اس نے کفر کا ارتکاب کیا۔ اور انکار کرنے والے دو ایک نہیں ساری دنیا بلکہ ساری کائنات ہو تو اللہ تعالیٰ کی جلالت شان اور عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سب اس کے محتاج اور نیازمند ہیں اور وہ سب سے بے نیاز ہے۔

عبادت کے ساتھ ساتھ دعا خود انسان کے اندر کی ایک طلب اور اس کی فطرت بشری کی

بازگشت ہے اس کو یوں بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ جیسے ہر طرف سے بند اور بھڑکتی ہوئی آگ بھاپ نکالنے کا راستہ چاہتی ہے۔ اور اگر وہ راہ نہ ملے تو وہ آگ بجھ کر راکھ بن جائے گی، بعینہٖ یہی حالت قلب کی ہے اس کی حرارت اور روشنی دعا سے قائم ہے، اگر وہ اس سے محروم ہے تو ایک جسم مفلوج ہے یا مردار ہے۔ جگر مرحوم نے خوب کہا ہے۔

آہ کہ نہ جانے بجھ بن کب سے
روح ہے لاشہ جسم ہے مدفن

اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا مظہر ساری کائنات ہے، جسم کو اپنا وظیفہ وجود ادا کرنے کے لیے ہر جگہ اور ہر زمانہ میں سہولتیں ملتی رہی ہیں، اس کی رحمت سے یہ بعید تھا کہ روح کی زندگی اور اس کی بقا کے لیے، اس کو بالیدگی بخشنے کے لیے کوئی انتظام نہ کرتا، انھیں انتظامات میں انسان کو مجبور و محتاج رکھنا بھی ہے، اور مصائب و مشکلات کے بھنور میں ڈالنا بھی ہے۔ مصائب کی بھٹی میں چڑھ کر اس کی فطرت سونا بن کر نکھر آتی ہے۔ اور چند لمحات کے لیے یا اس عرصہ مشقت کے لیے انسان یکسو ہو کر اپنے خالق سے قریب ہو جاتا ہے، مخلصین له الدین کا یہی مفہوم ہے اس اخلاص کی تعبیر آپ یوں بھی کر سکتے ہیں کہ اس کے اندر سویا ہوا بندہ مجبور مصائب میں بیدار ہوتا ہے، یہ اور بات ہے کہ مشکلات سے نکلنے کے بعد پھر اس پر غفلت طاری ہو جایا کرتی ہے، قرآن کریم نے انسانیت کی اس سرشت کی بڑی باریک بینی کے ساتھ اس کی تصویر کشی کی ہے۔

واذا انعمنا علی الانسان اعرض ونا بجانبه واذا مسه الشر فذو دعاء عریض۔

اور جب ہم آدمی کو نعمت عطا کرتے ہیں تو (ہم سے اور ہمارے احکام سے) منھ موڑ لیتا ہے اور کروٹ پھیر لیتا ہے اور جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو خوب لمبی چوڑی دعائیں کرتا ہے۔

حق تعالیٰ نے جہاں انسان کو وجدانی کیفیت کا مظہر بنایا ہے، وہاں کچھ اصول کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، دعاؤں کے سلسلہ میں قرآن کریم کی یہ آیت ہم سب کی زبان پر رہتی ہے۔

فاذا سألك عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوة الداع اذا دعان
فلیستجیبوا لی ولیؤمنوا بی لعلھم یرشدون۔ (البقرہ ۸۶)

اور جب آپ سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو میں قریب ہوں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ دعا کرتا ہے، لوگوں کو چاہیئے کہ میرے احکام قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں اس طرح توقع ہے کہ وہ ہدایت پا جائیں۔“

یہ آیت ایک مصیبت زدہ انسان کے لیے اکسیر رحمت کا حکم رکھتی ہے، جیسے کوئی جلتے ہوئے اور رستے ہوئے زخم پر لطف و کرم کا ٹھنڈا مرہم رکھدے، خشک اور مدت سے پیاسی زمین پر رم جھم بارش ہونے لگے، انداز بیان جلال وعظمت کا نہیں ہے جس میں جمع کا صیغہ آتا ہے، جیسے نحن خلقناھم وشددنا اسرھم واذا شئنا بدلنا امثالھم تبدیلا۔ اور کبھی فرمایا اِنّا نحن نزلنا الذکر ہم ہی ہیں جنھوں نے قرآن نازل کیا۔ بلکہ تمام ضمیریں واحد کی ہیں، جو قرب واختصاص خصوصی التفات ومناجات کی فضا قائم کر رہی ہیں سألک خطاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے وہ بھی واحد کی ضمیر سے، یعنی عبادی نہ کہ عبادنا، عنی میرے بارے میں نہ کہ عنا ہمارے بارے میں، انی قریب اجیب، دعانی۔ نحو کے خشک اور بے جان قواعد کی رو سے اذا سألک عبادی کے بعد کا جملہ متقاضی ہے کہ فقل کو محذوف مانا جائے، یعنی جب میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو کہہ دو کہ میں قریب ہوں۔ جیسے ذات پاک خود منتظر ہے کہ بندے دریافت کریں اور جیسے ہی دریافت کیا تو اتنا بھی فاصلہ اور دوری نہیں کہ مقام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یا فرشتے کے ذریعہ بھیج کر جواب دیا جائے، بلکہ خود دریائے رحمت جوش میں آجاتا ہے کہ میں قریب ہوں۔

قرب واختصاص کی یہ وجدانی کیفیت جب بندہ کو سرشار کر دیتی ہے اس وقت اس کے کان میں ایک اصولی بات بھی کہدی جاتی ہے کہ تم بھی تو میری بات مانا کرو اور مجھ کو مانو۔ یہ راستہ تو تم کو منزل تک پہنچا سکتا ہے۔ فلیستجیبوا لی ولیؤمنوا بی، اس طرح فرمایا گیا جیسے سر پر دست شفقت پھیرتے ہوئے، محبت اور نرمی کے لہجے میں کوئی اپنے بندے کو سوجھائے کہ میں تو داتا

ہوں۔ بخشنا اور درگذر کرنا میرا کام ہے، تم دریافت تو کرو میں تم کو وہیں پر ملوں گا، اور اس کے ساتھ ذرا اس پر بھی تو غور کرو کہ تم پر بھی کچھ فرض ہے، تمہاری بندگی کا بھی کچھ تقاضا ہے۔

مفسرین کہتے ہیں کہ إنى قريب جواب ہے ایک پوشیدہ سوال کا۔ جب فرمایا گیا، اذا سألك عبادى عنى، جب میرے بندے میری بابت پوچھیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیسے پوچھیں؟ اقرب ربنا فننا جيه کیا میرا رب اتنا قریب ہے کہ اس سے اپنے دل کی بات دل کی زبان میں کروں یا وہ دور ہے کہ اس کو پکاروں أم بعيد فننا ديه اس کا جواب دیا گیا انی قریب لیکن ان تفسیری نکات سے بلند قرآن کریم کا حکیمانہ اور بلیغ اسلوب ہے کہ جب میرے بندے مجھے پوچھیں تو میں قریب ہوں۔ کیونکہ ندا بھی آہستگی اور سرگوشی کے انداز میں ہوتی ہے، اذ نادى ربه ندا ءً خفيا۔ جب اس نے اپنے رب کو سرگوشی کے انداز میں دھیمی آواز میں پکارا اور وہ ذات جو نحن أقرب إليه من حبل الوريد۔ ہم اس کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہیں، فرمانے والی ہے اور وہ ہمیشہ قریب ہے۔

اس آیت کریمہ میں دعا کی ترغیب بھی ہے اور اصول کی تعلیم بھی ہے، انسانی سرشت میں نسیان اور حق ناشناسی اور احسان فراموشی بھی ہے، اور جب تک ضرورت و احتیاج رہے اس وقت تک مخلصين له الدين کی کیفیت اس پر طاری رہتی ہے اور جب سر سے مصیبت ٹل جاتی ہے، یا جب نعمت و کشائش حاصل ہوتی ہے اس وقت اس کے پر نکل آتے ہیں، اور وہ اترانے اور اکڑ دکھانے لگتا ہے، قرآن کریم نے انسان کو عجول عجلت پسند، هلوع کچے دل کا، کنود ناشکرا، إن الانسان لربه لكنود، اس سرشت بشری کی آئینہ دار یہ آیت کریمہ بھی ہے۔

هو الذى يسيركم فى البر والبحر حتى اذا كنتم فى الفلك وجرين بهم بريح طيبة وفرحوا بها جاءتها ريح عاصف وجاءهم الموج من كل مكان وظنوا أنهم احيط بهم دعوا الله مخلصين له الدين لئن أنجيتنا من هذه لنكونن من الشاكرين فلما أنجاهم اذا هم يبغون فى الارض بغير الحق۔

”وہی ذات ہے جو تم کو خشکی اور دریا میں چلنے اور سیر کرنے کی توفیق دیتی ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں (سوار) ہوتے ہو اور کشتیاں اُکے نرم جھونکوں سے سواروں کو لے کر چلتی ہیں تو وہ خوشی میں (اترانے لگتے ہیں) تو ناگہاں زمانے کی ہوا تیز ہے اور لہریں ہر طرف سے ان پر (جوش مارتی ہوئی آتی ہیں) تو اس

وقت خالص خدا ہی کی عبادت کرکے دعا مانگنے لگتے ہیں کہ اگر اے خدا تو نے ہم کو اس سے نجات بخشی تو ہم تیرے بے حد شکر گذار رہیں گے اور جب ان کو نجات دیدی تو پھر ناحق زمین میں شر پھیلانے لگے۔

اس سلسلہ میں ایک بات جو ہر جگہ اور ہر زمانہ میں پیش آتی ہے اور آئے دن سامنے آتی رہتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنی مراد برآری کے لیے دعائیں کرتا ہے، اور دعا ختم کرنے میں آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا ہے، کہ قبولیت کے آثار نمایاں ہوئے یا نہیں مصلحت خداوندی کا تقاضا تاخیر کا ہوتا ہے، یا دعا ایسی ہوتی ہے جو قانون تکوینی کے خلاف ہو، ایسی دعائیں بھی ہوتی ہیں، جن کی قبولیت کا مطلب کسی دوسرے انسان پر بے جا زیادتی اور ظلم ہو یہ تو اللہ جو خالق اور علیم وبصیر ہے وہی جانتا ہے کہ دعا مانگنے والے انسان کی بھلائی کس بات میں مضمر ہے، ایک بیمار کے بارے میں طبیب فیصلہ کرتا ہے کہ اس کے زخم پر نشتر لگایا جائے اس لیے کہ مریض کا فائدہ اسی میں ہے، مگر مریض چیختا ہے، فریاد کرتا ہے اپنے تیمارداروں اور طبیب کو ملزم وظالم قرار دیتا ہے، یا کوئی مریض ایسی چیز کھانا چاہتا ہے جس سے اس کا مرض بڑھ جائے، والدین اور اطبا اس کو منع کرتے ہیں، وہ اس کو سراسر زیادتی اور ظلم سے تعبیر کرتا ہے، لہٰذا دعا کے بھی اصول ہیں، یہ ایک وجدانی طلب ہے، وہاں جس سے دعا مانگی جارہی ہے وہ حکیم وبصیر بھی ہے، لہٰذا دعاؤں کے سلسلہ میں ہمارا کیا شیوہ ہونا چاہیئے اور ہم کو کس طرح راضی بہ رضا رہنا چاہیئے، اس مضمون کو امام غزالی نے الاحیاء میں، ابن القیم نے اعلام الموقعین میں، ابن تیمیہ نے منازل السالکین میں ایاك نعبد وایاك نستعین کی تشریح میں علمی ومنطقی اور قرآنی استدلالات سے بیان کیا ہے، لیکن ان سب پر بھاری اور جامع مضمون مجھے حضرت شیخ اکبر سیدنا عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مقالات میں طافتوح الغیب کے ۴۳ ویں مقالہ میں حضرت جیلانی قدس سرہٗ نے اس پر خاص انداز میں روشنی ڈالی ہے جو وجدان واصول دونوں پر جامع ہے۔

اس آیت کی توصیف کرتے ہوئے سید قطب مرحوم نے بڑے اچھے جملے لکھے ہیں،
انہا آیة عجیبة، آیة تسکب فی قلب المؤمن النداوة الحلوة، والود المؤنس، والرضی المطمئن والثقه والیقین، یعیش منها المؤمن فی جناب رضی، وقربی ندیة، وملاذ امین، وقرار مکین و فی ظل هذا الأنس الحبیب وهذا القرب الودود، وهذا الاستجابة الوحیة لوجه الله عباده إلی الاستجابة له والایمان به، لعل هذا یقود هم إلی الرشد والهدایة والصلاح۔

دعاؤں کے سلسلہ میں احادیث نبویہ اثر میں رہ نما ہیں، اور یہ رہنمائی دو طریقوں سے کی گئی ہے ایک تو خود دعا کر کے بتایا گیا ہے کہ اس طرح مانگو، اور دوسری دعا کی ترغیب کے لیے بڑے نادر مضامین بیان فرمائے گئے ہیں، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ، تینوں میں ابن میمون کی روایت حضرت سلمان فارسیؓ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:۔ ان الله یستحی أن یبسط العبد إلیه یدیه لیسأله فیهما خیرا۔ فیردهما خائبتین ۔ مسند امام احمد میں حضرت عبادہ بن الصامت کی یہ روایت ہے۔ ما علی ظهر الارض من رجل مسلم یدعو الله عزوجل بدعوة إلا آتاه الله إیاها، أو کف عنه من السوء مثله مالم یدع باثم أو قطیعة رحم۔
صحیحین کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: لایزال یستجاب للعبد مالم یدع باثم أو قطیعة رحم مالم یستعجل، قیل: یارسول الله ما الاستعجال قال: یقول قد دعوت فلم أر یستجاب لی فیتحسر عند ذلك ویدع الدعاء۔

ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ بلکہ ہم میں سے اکثر لوگوں کو تجربہ ہے کہ دعائیں کرتے ہیں اور جیسا کہ قرآن کریم کی ایک آیت میں کہا گیا ہے ذو دعاء عریض وقت پڑنے پر لمبی چوڑی دعائیں کرنے والے بن جاتے ہیں اور اپنی مرضی کے مطابق جب اس کی قبولیت کے آثار نہیں دیکھتے تو پھر یاس کی طرف مائل ہونے لگتی ہے۔ اور ایسے الفاظ زبان سے نکلنے لگتے ہیں جو نہ صرف آداب کے منافی ہیں بلکہ بسا اوقات کم ہمتی اور عجلت پسندی کفر کی حد تک پہنچا دیتی ہے۔ حضرت سیّدنا شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ نے "فتوح الغیب" میں متعدد مقالات میں اس

کیفیت کی وضاحت فرمائی ہے، ۳۴ویں مقالہ میں فرماتے ہیں:۔

ما اعظم تسخطك على ربك وتهمتك له وانتسابك له عزوجل بالظلم واستبطائك له فى الرزق والغنى، وكشف الكروب، والبلوى، اما تعلم أن لكل أجل كتابا ولكل بلية وكربة غاية ومنتهى ونفادًا، لايتقدم ذلك ولا يتأخر اوقات البلايا لاتنقلب، فتصير عوافيا ووقت البؤس لاينقلب نعمة وحالة الفقر لا يستحيل غناء۔احسن الأدب والزم الصمت والصبر والرضا والموافقة لربك وتب عن سخطك عليه۔ وتهمتك له فى فعله، ليس هناك استيفاء وانتقام من غير ذنب ويملى الطبع كماهو فى حق العبد بعضهم فى بعض هو عزوجل متفرد بالأزل وسبق الاشياء وخلقها وخلق مصالحها ومفاسدها فعلم ابتداءها وانتهاءها وانقضاءها وعاقبتها وهو عزوجل حكيم فى فعله متقن فى صنعه لايناقض فى فعله لايفعل عبثا ولا يخلق باطلا لعبا، لا يجوز عليه النقائص واللوم فى أفعاله انتظر الفرج إن عجزت عن موافقته وعن الرضا والفنا فى فعله حتى يبلغ الكتاب أجله فتسفر الحالة عن ضدها بمرور الزمان وانقضاء الأجال كما ينقضى الشتاء فيسفر عن الصيف وينقضى الليل فيسفر عن النهار، فاذا طلبت ضوء النهار ونوره بين العشائين لم تعطه بل تزداد فى ظلمة الليل حتى اذا بلغت الظلمة غايتها وطلع الفجر، جاء النهار بضوءه، طلبت ذلك واردته أوسكت عنه وكرهته، فاذا طلبت اعادة الليل حينئذ لم تجب دعوتك ولم تعطه، لأنك طلبت الشئ فى غير حينه ووقته، فتبقى خاسرًا منقطعا متسخطا وخجلا فارج الرخاء، كله والزم الموافقة وحسن الظن بربك

والصبر الجميل، فما لك لا تسلبه وما ليس لك لا تعطى ـ انك تدعو وتبتهل إلى ربك بالدعا والتضرع عبادة وطاعة وامتثالا لأمره فى قوله ادعونى استجب لكم وقوله واسألوا الله من فضله وغير ذلك فى الآيات والأخبار وانت تدعو وهو يستجيب لك عند حينه وأجله واذا اراد وكان ذلك فى مصلحة دنياك واخراك ووافق قضاءه وانتهاء اجله، لا تتهمه فى تاخير الاجابة ولا تسأم من دعائك فانك إن لم تربح لم تخسر ان لم يجبك عاجلا أثابك آجلا فقد جاء فى الحديث۔

ان العبد يرى فى صحائفه يوم القيامة حسنات لا يعرفها فيقال انها بدل سؤالك فى الدنيا لم يقدر قضاءها فيها أو كما ورد ـ ثم أقل أحوالك أن تكون ذاكرا لربك وموحدا له حيث تسأله ولم تسأل غيره ولم تنزل حاجتك لغيره: فأنت بين الحالتين فى زمانك كله ليلك ونهارك وصحتك وسقمك ولبؤسك ونعمائك وشدتك ورخائك اما ان تمسك عن السؤال وترضى وتوافق وتسترسل لفعله عز وجل كالميت فى يدى الغاسل والطفل الرضيع فى يد الظئر والكرة بين يد الفارس يقلبها بالصولجان فيقلبك القدر كيف يشاء ـ إن كان النعماء فمنك الشكر والثناء، ومنه عز وجل المزيد فى العطاء كما قال " لئن شكرتم لأزيدنكم "، وان كان البأساء فالصبر والموافقة منك بتوفيقه، والتثبت والنصرة والصلاة والرحمة منه بفضله كما قال عز من قائل إن الله مع الصابرين يعنى بالصبر والتثبيت وكما قال إن تنصروا الله ينصركم ويثبت أقدامكم، اذا نصرت الله من مخالفة هواك بترك الاعتراض عليه والتسخط بفعله فيك، وكنت خصما لله على نفسك، سيافا له عليها ـ فكلما تركت

بكفرها وشركها جرت رأسها بصبرك وموافقتك لربك
والطمانينة إلى فعله ووعده والرضا بهما، كان الله معينا ناصرا
اما الصلاة والرحمة فقوله « بشر الصابرين الذين اذا اصابتهم
مصيبة قالوا إنا لله وإنا اليه راجعون، اولئك عليهم صلوات من
ربهم ورحمة واولئك هم المهتدون۔
والحالة الأخرى انك تبتهل إلى ربك بالدعاء والتضرع اعظاما له
وامتثالاً لامره ادعوا ربكم، وضع الشئ في موضعه لاندبك إلى سواله
وجعل ذلك لك مستريحا ورسولا منك اليه ومواصلة ووسيلة لديه
بشرط ترك التهمة والسخط عليه عند تاخير الاجابة إلى حينها، اعتبر
مابين الحالتين ولا تجاوز حديهما، فانه ليس هناك حالة اخرى فاحذر
أن تكون من الظالمين المعتدين، فيهلك كما اهلك من مضى من الأمم
السابقة في الدنيا بتشديد بلاءه وبالآخرة بأليم عذابه۔

حضرت شیخ عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فارسی میں فتوح الغیب کی شرح و ترجمانی انتہائی دلآویز اسلوب میں کی ہے، اصحاب ذوق کے لیے حضرت جیلانی کے ملفوظات کا عکس جمیل ان کی تحریر میں ملتا ہے وہ قدیم شارحین کے انداز پر ہر فقرہ کا معنی خیز ترجمہ کرتے ہیں۔ اور اکثر اس میں فارسی اشعار نگینے کی طرح جڑ دیتے ہیں ترجمہ کا انداز یہ ہے۔ قال رضی اللہ عنہ وارضاہ، ما اعظم تسخطك على ربك وتهمتك له چه عجب بسیار است ناخوش بودن وخشم گرفتن تو بر پروردگار تو، و تہمت نہادن تو مر او را۔ وجل بجہل وتخیل وسفہ دراں کہ خلایق جناب قدس است۔ اہل اللہ کے کلام کی اہل دل ہی ترجمانی صحیح کرسکتے ہیں، ہم جیسے کم فہم و کج فہم بھی اپنی وسعت کے مطابق مطلب سمجھنے کی کوشش کریں تو اس طرح ترجمانی کرسکتے ہیں کہ حضرت شیخ جیلی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

کس درجہ تمہیں اپنے پروردگار سے بڑی اور ناراضگی ہے، کتنی جھنجھلاہٹ ہے تمہیں کہ دعائیں

باب اجابت کررہی ہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کی طرف تمہیں ظلم کا خیال آتا ہے، تم اس حد تک بڑھ جاتے ہو کہ اس کی ذات والاشان کو متہم کرتے ہو، رزق روزی، اور خوش حالی کے حصول اور مصائب ومشکلات سے نجات پانے میں انتظار کی جو گھڑیاں گزر رہی ہیں وہ بہت طویل معلوم ہو رہی ہیں، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہر کام کا وقت مقرر ہے، ہر مصیبت کی ایک خاص مدت مقرر ہے جس میں وہ ختم ہوگی، وقت سے پہلے وہ مصیبت دور نہیں ہوگی اور جب اس کے دور ہونے کا وقت آجائے گا تو ایک لمحہ کی تاخیر نہ ہوگی۔ مصائب کی گھڑی عافیت کی ساعت میں نہیں بدل سکتی، تنگی کی گھڑی خوش حالی میں یکایک تبدیل نہیں ہوسکتی۔

کردگار آں کند کہ خود خواہد
حکم بر کردگار راہ نتواں کرد

لہٰذا ادب ملحوظ رہے، زبان بند رکھو، صبر ورضا اور مرضی مولیٰ پر راضی رہو، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بدگمانی وبرائی کے ارتکاب سے باز رہو اور اس پر توبہ کرو، اس کے کام وانتظام کو متہم نہ کرو، بارگاہ خداوندی میں کسی کا حق نہیں مارا جاتا اور نہ اس کی جناب پر بندۂ مجبور سے انتقام کا گمان ہوسکتا ہے، اس بارگاہ کا معاملہ انسانوں کے درمیان حسد وکینہ اور انتقام وشفاء غیظ کے معاملہ جیسا نہیں ہے، وہ ذات والاشان ازلی ہے ہر شے سے پہلے اور سب کی خالق ہے مصلحت ومضرت سے خوب واقف ہے، اس کو ابتدا کی بھی خبر ہے اور انتہا کی بھی، ہر کام کی ابتدا کب ہونا چاہیئے اور اس کی انتہا کیا ہے، اس کو خوب معلوم ہے، اس کے افعال حکمت پر مبنی ہیں، وہ کوئی کام بلا مصلحت نہیں کرتا، کوئی شے بلا مقصد سامنے نہیں آتی، اس کی ذات والاشان میں کوتاہی کا گزر نہیں، اور نہ الزام تراشی کی کوئی گنجائش ہے، اگر مرضیٔ مولیٰ پر رضا مند نہیں ہوسکتے تو کشائش کا انتظار تو کرسکتے ہو، اس کی رضا پر اور اس کی مرضی کے آگے سرِ تسلیم خم رکھو یہاں تک کہ وہ وقت آجائے جس کا تمہیں انتظار ہے، اور جو حالات درپیش ہیں ان کے مقابل دوسرے حالات پیش آجائیں۔ جس طرح موسم سرما ختم ہوتا اور موسم گرما داخل ہوجاتا ہے رات ختم ہوتی ہے اور دن نمودار ہوتا ہے، اگر تم مغرب وعشاء کے درمیان دن کی روشنی طلب

کرو گے تو تمہاری طلب پوری نہیں کی جائے گی اسکے برعکس رات کی تاریکی بڑھتی رہے گی، یہاں تک کہ ظلمت شب کی مدت مکمل ہو جائے اور سپیدۂ سحر نمودار ہونے کا وقت آجائے، خواہ تم اس کو طلب کرو یا نہ کرو چاہو یا نہ چاہو، پھر دن کی روشنی میں اگر تم اسی لمحہ تاریکی شب کی دعا مانگو گے تو یہ بھی دعا قبول نہ ہوگی، کیونکہ تم ایک چیز کو نا وقت طلب کر رہے ہو۔ (جو اس کی سنت تکوینی کے خلاف ہے) تم دعائیں کرتے کرتے تھک جاؤ گے اور مایوسی و محرومی کا شکوہ کرو گے تو یہ شکوہ بے جا ہوگا لہذا ایسی بات سے پرہیز کرو، اپنے پروردگار سے حسن ظن قائم رکھو اور اس کے نظام سے راضی رہو، صبر جمیل کو اپنا شعار بناؤ، جو تمہیں ملنے والا ہے، اس کو کوئی سلب نہیں کر سکتا، اور جو نہیں ملنے والا ہے وہ تم کو حاصل نہیں ہو سکتا، تم گریہ وزاری کرتے رہو اور خشوع و خضوع سے دعا کرتے رہو یہ تمہاری عبادت و اطاعت ہے، اس کے حکم کی تعمیل ہے کہ اس نے فرمایا ہے، ادعونی استجب لکم مجھ سے مانگو میں قبول کروں گا، لہذا اس کے فضل و کرم سے آس لگائے رکھنا کم نہ کرو، آیات کلام اللہ اور ارشادات نبویہ کو سامنے رکھو، تم جب اس کو پکارتے ہو تو وہ تمہاری ہر دعا سنتا ہے اور اپنے انتظام و مصلحت کے مطابق اس کو قبولیت سے نوازتا ہے اگر تمہاری طلب تمہاری اپنی مصلحتوں اور دنیا و آخرت کی بھلائیوں کے لیے مفید ہوتی ہے تو اجابت میں ذرا تاخیر نہیں ہوتی۔ اے لوگو! اپنے پروردگار پر اتہام نہ لگاؤ کہ ..... دعائیں قبول نہیں کرتا، تم دعا کر کے کبھی بھی گھاٹے میں نہیں رہو گے، اگر تمہاری مراد پوری نہیں ہوئی تو نقصان بھی نہیں ہوا، اگر قبولیت دعا کا اثر فوری طور پر ظاہر نہیں ہوا تو آخرت میں اس کا اجر رکھا ہے حدیث شریف میں وارد ہے کہ ان العبد یری فی صحائفہ یوم القیامۃ حسنات لم یعرفھا فیقال لہ، انھا بدل سؤالک فی الدنیا الذی لم یقدر قضاءہ فیھا او کما ورد۔

یعنی بندہ قیامت کے دن اپنے نامۂ اعمال میں چند نیکیاں ایسی پائے گا جن کو نہیں سمجھ سکے گا کہ کہاں سے آگئیں تو اس سے کہا جائے گا کہ دنیا میں تم نے چند دعائیں ایسی کی تھیں جن کی قبولیت مقدر نہ تھی یہی باتیں آج نیکیاں بن گئیں۔

اور دعا کرنے کی حالت میں تمہارا کم سے کم فائدہ یہ ہے کہ جتنی دیر تم دعا میں مشغول رہتے ہو

اتنی دیر تک تم حق تعالیٰ جل شانہٗ کی حضوری میں رہتے ہو، اور ذکر کی دولت نصیب رہتی ہے خدائے واحد کی قدرت وعظمت کا استحضار رہتا ہے، اور تمہاری لو اس سے لگی رہتی ہے، تم غیر اللہ سے کٹ کر اس کی ذات سے اپنی امیدیں وابستہ کئے رہتے ہو۔ لہذا تم اپنی زندگی کی دونوں حالتوں میں خواہ صحت کی حالت ہو یا علالت کی، تنگی کی ہو یا کشایش کی، مصیبت کی ہو یا راحت کی، یا تو زبان بند رکھو گے، اور مرضی مولیٰ پر راضی رہو گے اس کے پیدا کردہ حالات سے اپنے آپ کو پابند رکھو گے اور اس کے احکام پر اس طرح چلو گے کہ تمہاری حالت ایسے میت کی ہوگی جس کو غسل دیا جارہا ہو اور غسل دینے والے جس کروٹ چاہیں اس کو الٹیں پلٹیں۔ یا ایسے شیر خوار بچے کی طرح جو دایا کی گود میں ہو، یا ایسے گیند کی طرح جس کو شہسوار اپنے چوگان سے گھما رہے ہوں، اسی طرح تقدیر تم کو گردش میں رکھتی ہے، اور اگر تم خوش حالی کی نعمت سے سرفراز کئے گئے ہو تو تمہارا کام شکر گذاری اور اس کی حمد وثنا ہے، جس کے عوض میں اللہ کی طرف سے جود وبخشش میں اضافہ ہوتا رہے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "لئن شکرتم لازیدنکم"، یعنی اگر تم شکر کرو گے تو میں بہت بڑھاؤں گا، اور اگر تنگی اور مصیبت کی حالت میں تم گرفتار ہو تو تمہارا شیوہ صبر اور اللہ تعالیٰ کی مرضی پر اپنے آپ کو راضی رکھنا ہے، اور اللہ کی طرف سے تمہیں ثابت قدمی، مدد غیبی سکون، اور قلبی اطمینان کی نعمت ملے گی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

"ان اللہ مع الصابرین"، یعنی اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے وہ ان کی مدد فرماتا ہے اور ان کو ثابت قدم رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ صابروں کو اپنی مدد اور ثابت قدمی کی توفیق سے کیونکر محروم فرمائے گا۔ جبکہ اس کے علاوہ اس کا کوئی معاون و مددگار نہیں ہے، اور نفس کے اور شیطان کے مقابلہ میں اس کا کوئی حامی و مددگار نہیں ہے جیسا کہ ارشاد ہے "ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تم کو ثابت قدم رکھے گا، تم اللہ کی مدد کس طرح کر سکتے ہو جبکہ وہ غنی ہے اور تم محتاج ہو، اس کے پاس سب کچھ ہے تمہارے پاس کچھ بھی نہیں، لہٰذا یہاں اللہ کی مدد کرنے کا مطلب ہے کہ اپنے نفس کی خواہشات کے خلاف کرنے میں اور اس کے احکام کی تعمیل میں اپنے آپ کو مستعد کر لو اور اس پر اعتراض

کرنا چھوڑ دو اور تمہارے بارے میں جو اس کے فیصلے ہیں اس پر جھنجلاہٹ اور ناخوشنودی کا اثر دل پر آنے دو اس صورت میں تم اپنے نفس کے خلاف جنگ کرنے میں اللہ کے مددگار بن جاؤ گے، اپنے دل کی چاہت چھوڑنے میں اور نفس کو کچلنے میں اس کی رضا کا کام کروگے اور نفس جب بھی سر اٹھائے گا اور شورش پر آمادہ ہوگا تو اس کا سر کچل دو گے، اپنے صبر اور راضی برضا رہنے اور اس کے احکام اور وعدوں پر اطمینان قلب حاصل کرنے میں تمہارا شیوہ وہی ہوگا جو اللہ کی مرضی ہوگی، اس طرح اللہ تمہارا معین و مددگار ہوگا، اور اس کی طرف سے رحمتوں کا نزول بے پایاں ہوگا جس کو عربی میں صلوٰۃ کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، وبشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون اولئک علیھم صلوٰت من ربھم ورحمۃ واولئک ھم المھتدون۔ ان صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنا دیجئے جن پر کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں اور ایسے ہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

دوسری حالت یہ ہے کہ تم حق تعالیٰ جل شانہ کے حضور سر نیاز خم کرو، دعا و مناجات کو اپنا شعار بناؤ گریہ وزاری اور شرمساری کے ساتھ اس کے آگے دست سوال دراز کرو کہ یہ اس کے حکم کی تعمیل ہے اور ہر کام کو اپنے وقت اور جگہ پر کرنے کا اصول ہے، کیونکہ دعا کرنے سے تمہارے دل کی کدورت معدوم ہو جائے گی، قلب میں ٹھنڈک پڑے گی، آنکھوں کی راہ سے دل کا غبار نکلے گا اور خدا کی مرضی پر چلنے اور اس کے فیصلے پر راضی ہونے کی خو پیدا ہوگی، لیکن یہ خصوصیت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں گستاخی اور دعا کے عدم قبولیت کا اتہام نہ لگاؤ اور کشائش میں تاخیر کو اپنے حق میں زیادہ نہ سمجھو، لہٰذا اے لوگو اپنی زبان بند رکھو یا دست سوال دراز کرو دونوں حالتوں میں راضی بہ رضا ہونا شرط ہے، اس کے علاوہ جو راہ بھی ہے وہ ہلاکت کی راہ ہے اور نافرمانی اور ظلم کی وہ راہ ہے جس پر چل کر پچھلی قومیں ہلاک کر دی گئیں، تم ہمیشہ یہ پڑھا کرو۔ یاعالما بحالی علیک اتکالی (اے میری حالت کے جاننے والے تجھی پر میرا بھروسہ ہے اور تو ہی میرا آسرا ہے)

حضرت شیخ سیدنا محی الدین عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ملفوظ شریف کے بعد کسی توضیح کی حاجت نہیں رہی اور اسی پر مقالہ ختم کرتا ہوں۔ **

ڈاکٹر سید وقار احمد رضوی

حافظ ابراہیم کی عربی منظومات کے اردو نثری تراجم

۱۸۷۱ء ــــ تا ــــ ۱۹۳۲ء

پورا نام محمد حافظ بن ابراہیم فہمی ہے۔ لیکن عرف عام میں حافظ ابراہیم کے نام سے مشہور ہیں وہ مصر کے دیروط نامی ایک قصبے میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں ان کے والد ماجد کا انتقال ہوگیا۔ ابتدائی وثانوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد قلیل مدت تک طنطا میں قیام کیا۔ اور اسی جگہ شاعری اور مطالعہ کا شوق ہوا ـــــ پھر فوجی اسکول میں تربیت حاصل کی اور مصری فوج کے افسر مقرر ہوئے۔ بعد میں فوجی ملازمت سے علاحدگی اختیار کرلی۔ اسی زمانہ سے ان کی تمام تر توجہ شعر و شاعری کی طرف ہوگئی۔ ملک کے مشہور و معروف شعراء اور ادیبوں سے ملاقات ہوئی اور ان سے استفادہ کیا۔ اسی دوران ان کے تعلقات شیخ محمد عبدہ سے ہوگئے۔ ان کے علم وفن سے فائدہ اٹھایا۔ ۱۹۱۱ء میں دارالکتب المصریہ کے شعبۂ ادب کے صدر متعین ہوئے۔ اور آسودہ زندگی بسر کی۔ وہ انتہائی نرم دل اور رقیق القلب انسان تھے۔ ان کی طبیعت میں دردمندی تھی۔ ان کے دل میں جذبہ خدمت موجزن تھا۔ وہ تلخیٔ ایام سے بھی دوچار ہوئے۔ مگر طبیعت میں زندہ دلی تھی۔ مبدأ فیاض نے بہترین ذہن اور اعلیٰ دماغ عطا کیا تھا۔ عربی ثقافت اور زبان و ادب کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں سوز و گداز اور موسیقیت ہے۔ وہ قوم کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے تھے۔ اسی لیے ان کے کلام میں قوم کے رنج و محن کی

عکاسی ملتی ہے۔ وہ قومی مسائل کی مؤثر انداز میں ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں تاثیریت ہے۔ اسلوب نگارش سادہ مگر دلکش ہے۔ ان کو الفاظ پر دستگاہ حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فنی اعتبار سے بلند درجہ رکھتے ہیں۔

حافظ کو اگر قومی شاعر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ سماجی اور قومی مسائل پر ان کی گہری نظر تھی۔ وہ عوام میں جاکر ان کے مصائب میں شریک ہوتے تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں سوسائٹی کے اسقام و امراض کی نشاندہی کی ہے۔ اور عربی زبان کی پامالی اور قومی زوال پر نوحہ خوانی کی ہے۔ وہ نوجوانوں کو برائیوں اور خرابیوں سے بچنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اور معاشرے کی تشکیل نو کی دعوت دیتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے جابجا باہمی نفاق، پھوٹ، انتشار، اقوام غیر یا انگریز کے غلبے سے متنبہ کرتے ہوئے عربی زبان و ثقافت کی ابتری پر آنسو بہاتے ہیں۔ اور قومی جذبات کو ابھارا ہے انھوں نے اپنی شاعری میں تابناک مستقبل اور نوید صبح کا پیام دیا ہے۔

ان کی بعض نظموں کے تراجم یہ ہیں۔

عنوان نظم :- يَشكُوعَن الدهرِ ويَبكِي مَعَ على الاوطان

اپنے زمانہ سے شکوہ سنج اور وطنوں پر گریہ کناں ہے۔

۱۔ تو نے سفروں اور مشقت برداشت کرنے اور اپنی عمر کو تگ و دو میں خرچ کرنے سے کیا پایا مطلب ساری عمر صعوبتوں میں غلطاں و پیچاں رہا، حاصل کیا ہوا۔

۲۔ تو ایک ایسی شے کی تلاش و جستجو میں سرگرداں ہے جس کا حصول آسان اور سہل نہیں (یعنی عقدۂ مشکل پسند ہے) مزید برآں یہ کہ تیرے پاس مال و دولت بھی نہیں (جس کے ذریعہ مقصد برآری ہو)

۳۔ اے لوگو! تم مجھے اس لغزش (سفر) پر دندان ملامت سے مت چبا ڈالو (یعنی ملامت نہ کرو) کیونکہ میں تو عجیب عجیب چیزوں کے اترنے کی جگہ ہوں۔ (یعنی مہم جو ہوں)

۴۔ کاش! میرے ماں باپ مجھے پیدا ہوتے ہی سمندر میں ہلاک کر دیتے۔ (تاکہ

آج میں اس برے دن کو نہ دیکھتا)

۵۔ میں جس چیز (اندوہ غم) کو جھیل رہا ہوں شاید مانی بھی اس سے دوچار ہوا ہو۔ پس اس نے اس رنج والم کی بستی سے ہمارا جلدی گزر جانا بہتر تصور کیا (مانی فارس کا مشہور مصوّر اور مذہب مانویہ کا بانی)

۶۔ میں نے اپنا شباب اللہ کی راہ (عبادت) میں صرف کیا جس کے لیے میں طالب اجر و ثواب ہوں۔ دنیا بوڑھی ہوگئی مگر میرا عزم بوڑھا نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس عزم (جوان) کو رکھے۔

۷۔ میں جنگلوں میں کس قدر پا بہ جولاں رہا ہوں۔ درآں حالیکہ غزال و آہو قیلولہ کر رہے تھے، اور آفتاب سطح زمین پر انگارے اگل رہا تھا۔

۸۔ میں نے کس قدر ظلمتوں کا لباس پہنا اس حال میں کہ سارا عالم خواب آگیں تھا۔ جس طرح میرا قلب تکلیف کے وقت پرسکون و مطمئن ہوتا ہے اسی طرح وہ رات اس سے زیادہ پرسکون تھی۔

۹۔ ستارے کو میرے حال پر تعجب ہے اور چونکہ میں سالک اللیل ہوں (اس لیے وہ مجھے) سبع سیارہ (سات ستاروں) کے جھرمٹ میں آٹھواں ستارہ گمان کرتا ہے۔

۱۰۔ میں ہمیشہ رہین ستم ہائے روزگار رہا۔ اور دستِ تقدیر برابر مجھے میرے مقصد سے دور رکھتا رہا۔

۱۱۔ اور تحقیق صبح کی میں نے اس حال میں کہ میری امیدیں پامال تھیں۔ اور میرے معاملے میں وہ چیز تھی جو "گو" کی دُم میں ہوتی ہے۔

۱۲۔ شرقی نسب ہونا اگر میرے حق سے مانع ہے تو وائے بر شرف ترک و عرب۔

۱۳۔ ترک و عرب کی ان شمشیروں پر افسوس ہے کہ جب وہ میان سے باہر آتی تھیں تو مغرب خوف سے لرزہ براندام ہو جاتا تھا۔

۱۴۔ مشرق میں ترک و عرب کی اس مشعل پر افسوس ہے جو نہ بجھتی تھی اور نہ اس پر مکر و کذب کا رماد چڑھا۔

۱۵۔ کاش وہ وقت آئے جب نیل کے گھاٹ اغیار کے لیے میٹھے نہ ہوں (سوائے) ان لوگوں

کے جو اللہ سے ڈرنے والے اور ثواب کے انتظار یعنی امید رکھنے والے ہیں۔

۱۶۔ پس تحقیق ہو گیا ہے مصر اس حال میں کہ جب اس کے (ماضی) کا ذکر کیا جاتا ہے تو میری مژگان، اس (مصر) کے لیے لولوئے نم کی سخاوت کرتی ہیں۔
(یعنی مصر کے شاندار ماضی کو یاد کر کے آنسو بہاتا ہوں)

۱۷۔ وہ چیز (بلا) جو اس (مصر) پر نازل ہوئی ہے۔ اس کے تذکرے کے وقت گویا میں وہ شجاع ہوں جو مرگ و فرار کے درمیان متردّد ہو (یعنی اگر بھاگتا ہوں تو باعث ننگ اور اگر نہیں بھاگتا تو موت کا خوف ہے) اس طرح اگر میں حدیث وطن کے لیے کوشاں نہیں ہوتا تو عار کا ڈر ہے اور اگر کوشاں ہوتا ہوں تو قید و بند کا خوف ہے۔

۱۸۔ جب میں مصر کی آزادی کے لیے سخن سرا ہوتا ہوں تو قید خانے کا صحن میری تکیہ گاہ ہے۔ اور اگر میں سکوت اختیار کرتا ہوں تو اس چیز کو نفس گوارا نہیں کرتا۔

۱۹۔ کیا ہمارا صبح کا چلنے والا اور شام کا چلنے والا، شکوہ سنج فقر و افلاس ہے حالانکہ ہم سرزمین زر پر چلتے ہیں۔

۲۰ فرنگی قوم (انگریز) مصر میں اسفنج کی طرح ہے۔ (جو اگر پانی میں ڈالی جائے تو پانی کو چوس لیتی ہے) (جو) بے شک پانی کے ساتھ کامیاب ہوئی ہے۔ ان لوگوں (انگریزوں) نے دوہنے والے کے لیے تھن بھی نہیں چھوڑا۔ (یعنی سب زر و جواہر اور مصر کی دولت لے گئے)

۲۱۔ اے آلِ عثمان! کیا یہ سختی (استبداد) اور جفا ہمارے لیے ہے حالانکہ (ہم) دین و مصحف میں بھائی بھائی ہیں۔

۲۲۔ تم نے ہمیں ایک ایسی قوم (انگریز) کے سپرد کر دیا ہے جو ہمارے مذہب، اخلاق و ادب اور شرف کی مخالف ہے۔

عنوان نظم ۲ دَوْلَةُ السَّيْفِ وَالْمِدْفَعِ

شمشیر اور توپ کی دولت

۱۔ اے دولتِ شمشیر ہائے آبدار! اور اے لمبے باریک سنانوں (تیروں) کی صولت!

۲۔ تم نے قرونِ ماضی میں ممالک کو کس قدر مضبوط و مستحکم کیا۔ ایسے ممالک جن کا ملنا دشوار تھا۔
۳۔ وہ ممالک سفید شمشیر بُرّان کی دھار اور لچکدار گندم گون بھالوں سے درست یعنی مضبوط ہوئے۔
۴۔ وہ دولت شمشیر و سنان (اب) شوکت پاستان بن کے رہ گئی ہے۔ اور اس کی جگہ دولتِ بزرگ (مدفع) نے لے لی۔
۵۔ یعنی پُرعظمت توپ کی حکومت جس کی طاقت آگ اور دھماکوں سے عبارت ہے۔
۶۔ وہ دولت مدفع، بہادروں کے دلوں کو خوف زدہ کرتی ہے اور پہاڑوں کو ہلا دیتی ہے۔
۷۔ وہ توپ شیروں کو ان کے بیشوں میں ڈراتی ہے اور وہ عمروں اور امیدوں کی قاطع ہے۔
۸۔ وہ جنگ میں میلوں کے (فاصلے) سے جانیں لے لیتی ہے۔ کوہ آتش فشاں کی طرح۔
۹۔ پس وہ پے بہ پے خوف در خوف (مصائب) لاتی ہے اور پے بہ پے آگ برساتی ہے۔
۱۰۔ پس وہ کھوپڑیوں کو پھاڑتی ہے اور (کچھ) پروا نہیں کرتی۔
۱۱۔ وہ توپ مارنے والے ستارے (شہاب ثاقب) کی طرح ہے جو اوپر سے گرتا ہے اور اس طرح ٹوٹ پڑتا ہے جس طرح فکر دل (و دماغ) میں سرایت کر جاتی ہے۔
۱۲۔ وہ (شہاب) اس سرکش حیلہ گر شیطان (معاند) پر گرتا ہے جو تاریکی میں باتوں کو چُراتا ہے۔

لوٹ:— یہ اشارہ ہے قرآن مجید کی اس آیت مبارکہ کی طرف جس میں ارشاد ہوا ہے کہ جب شیاطین عالم بالا کی طرف اسرار الٰہی سننے کے لیے جاتے ہیں تو ان کی سرکوبی کے لیے شہاب ثاقب پھینکا جاتا ہے۔ تاکہ وہ آسمانوں سے پلٹ کر آجائیں۔

۱۳۔ وہ (شیطان) عالم بالا سے باتوں کو چُرانے والا ہے۔ وہ مارنے والا ستارہ (شہاب ثاقب) ہبوط و ضرر رسانی میں اس مدفع (توپ) سے زیادہ نہیں بوقت قتال۔
۱۴۔ جب (توپ) کے قہرناک دہن سے وبال کا گولہ نکلتا ہے۔
۱۵۔ تو وہ میدانِ جنگ میں لوگوں کو برق و رعد و مرگ (اموات) سے ڈراتا ہے۔
۱۶۔ وہ توپ اُس سیف قتالہ کی مثل نہیں جو سروں اور جوڑوں میں شگاف ڈالتی ہے۔
۱۷۔ وہ شمشیر قول میں خاموش اور کام کرنے میں بولنے والی ہے۔ میں اس کو مثال میں مثل قوم پاتا ہوں

۱۸۔ کہ وہ قوم، قول سے کام کی طرف رُخ کرنے والی ہے۔ پس مالک ہوگئی وہ بڑے بڑے مراتب کی۔

غزل

۱۔ میں ایک عاشق گرفتار ہوں اگر تو نہیں جانتا۔ وہ غم (عشق) جو میرے سینے میں سرایت کر گیا ہے میں تجھے اس سے پناہ دیتا ہوں۔ (یعنی اس کے باوجود تجھ کو پناہ دیتا ہوں)

۲۔ اے میرے دونوں دوستو! رات اپنا لباس (پہن) کر آئی ہے۔ پس تم میں سے ہر ایک کھڑے ہو جاؤ تاکہ ہم جاگنے کے لیے صبر کی زرہ تلاش کریں۔

نوٹ:۔ عربی شاعری کی روایت کے مطابق عربی شاعر دو رفیقوں کو تخاطب کرتا ہے۔ چنانچہ امراؤالقیس کا شعر ہے ؎

قفانبكِ مِنْ ذِكْرىٰ حَبِيبٍ وَمَنْزِلِ
بِسِقْطِ اللِّوَىٰ بَيْنَ الدخُولِ فَحَوْمَلِ

اے میرے دونوں دوستو! ذرا ٹھہرو تاکہ میں دیارِ محبوب کی یاد کر لوں جو لوی، دخول اور حومل کے درمیان واقع ہے

۳۔ ہم ایک محفوظ منزل (وطن) کی (راہ) پر گامزن ہیں۔ جو ہمیشہ تیار رہنے پر اکساتی ہے۔ اگرچہ یہ مرکب دشوار طلب ہے۔

۴۔ اے میرے دونوں دوستو! رات کی عمر طویل ہوگئی ہے۔ اب باتوں اور قصّوں کے سوا (کچھ) نہیں۔

۵۔ پس تم اپنی یادداشت سے اچھی باتیں لاؤ یعنی سناؤ تاکہ میں ان سے محفوظ ہوں کیونکہ قصّے مثل بادہ ہوتے ہیں۔

عنوان نظم ۳: ہماری تکالیف اور ہماری امیدیں

۱۔ تحقیق دور ہوگئی ہے تاریکی، تو کب سوئے گا؟ کیا فکر نے تیری نیند کو اڑا دیا ہے یا عشق نے؟

۲۔ سو گیا ہے غمگین اور شاکی (یعنی محتاج) اور مصیبت زدہ اور سو گیا عاشق سرگشتہ۔

۳۔ اور تو اب تک اپنی دونوں ہتھیلیوں کو مسلتا ہے۔ اور تجھ کو بیماری (فکر) بہت دیر سے کروٹیں دلوا رہی ہے۔

۴۔ تجھ سے آنسو بہے۔ یہاں تک کہ تیری آنکھوں سے بادلوں نے رونا سیکھ لیا۔

۵۔ تیری کروٹوں سے بستر چیخنے لگے، اور تیرے غم (عشق) سے تاریکیاں ڈریں کہ مبادا اس کے شعلوں (شعلۂ عشق) کی روشنی سے تاریکی ختم ہو جائے۔

۶۔ تو جاگ کر آسمانوں (فلک ناہنجار) کا مقابلہ کرتے ہوئے رات گذارتا ہے۔ حالانکہ زمانے کی آنکھ پر نیند چھائی ہے۔ (مطلب جب سارا عالم سوتا ہے۔ تو جاگتا رہتا ہے)

۷۔ جس حرف عشق کو کلام (بولنے نے) چھپایا تھا اس کو (تیری) خاموشی نے عیاں کر دیا۔

۸۔ تیرے رب کی قسم کیا تو ابتدائے عشق کی طرف لوٹا ہے؟ یاد (وطن) سے۔ اور کیا عشق پھر عود کر آیا ہے؟

۹۔ حالانکہ مثل سیف بڑھاپا جھکا ہے اور موت نے تیری دونوں کنپٹیوں پر (بڑھاپے کی) تلوار کو معلق کر دیا ہے۔

۱۰۔ کیا ادیب یعنی ادیب مصر کو اس طفل (شیر خوار) کی طرح رونا اچھا لگتا ہے جس کو دودھ چھڑانے، نے تکلیف دی ہے۔

۱۱۔ عشق نے اس ادیب کو مصر کی یاد (یعنی حب الوطنی) سے بھیر دیا ہے۔ حالانکہ مصر باغیوں (دشمنوں) کے ہاتھ میں ظلم کیا جاتا ہے۔

۱۲۔ میں اپنے قلم کو معدوم کر دوں اگر وہ چیز (عشق) میرے ساتھ ہو۔ (جبکہ) پسلیوں (پہلو) کے درمیان عشق کے لیے بھڑکنا ہے۔

۱۳۔ اور میں عشق کے ساتھ نہیں ہوں (کیونکہ) بڑے بڑے مصائب نے میرے شباب کو فنا اور ہلاک کر دیا ہے۔ اور میرا سر سفید ہو گیا ہے۔

۱۴۔ میرے اس پروردگار نے میری پرورش کی جس نے لبید شاعر (لبید بن ربیعہ) کو پالا تھا۔ پس

اُس نے مجھے وہ (کچھ) سکھایا جس سے مخلوق ناواقف تھی۔

۱۵۔ تیری عمر کی قسم! میں غیر مصر کے لیے پریشان حال نہیں ہوں۔ اور نہ سوائے مصر کے میرے (سامنے) کوئی مقصد ہے جس کا عزم کیا جائے۔

۱۶۔ میں مصر کی اس عظمتِ پارینہ کو یاد کرتا ہوں جب بڑے بڑے فراعنہ (بادشاہ) مصر کے ساتھ (یعنی مصر کی مدد سے) حملہ آور ہوتے تھے۔ (اغیار پر)

۱۷۔ اور ان ایّام کو یاد کرتا ہوں جب مصر کے پاس کامل اور بہادر آدمی (سپاہی) تھے اور ایک زمانہ اس کا غلام تھا۔ (زیرنگیں تھا)

۱۸۔ (واقعات وحوادث) نے میری خوابگاہ کو مضطرب کر دیا ہے۔ رات گذاری مصر نے اس چیز (یعنی واقعات وحوادث) میں (یعنی مصر واقعات وحوادث کا شکار رہے) پس کیا میں ملامت کیا جاتا ہوں؟

۱۹۔ میں قوم کو راہِ اعداء میں دیکھتا ہوں کہ لاعلاج بیماری اس کی ہڈیوں سے گودا نکالتی ہے۔

۲۰۔ جب مصر پر کوئی مصیبت کا سال گذرتا ہے تو پے بہ پے دوسرا مصیبت کا سال اس پر آجاتا ہے۔

۲۱۔ مل کر کھانے کی بیماری اس مصر پر سرایت کر گئی ہے۔ یہاں تک اس گروہ (انگریز) نے اس کا رزق چھین لیا ہے۔

۲۲۔ ہمارے حکماء پر اس بیماری (کھانے کی) کا علاج دشوار ہو گیا ہے۔ جیسا کہ طب پر جذام کا علاج دشوار ہو گیا ہے۔

۲۳۔ ایک مرد کی ہلاکت اس کا کمزور ہونا ہے (یعنی ناتوانی یا بزدلی) اور ایک قوم کی موت اس میں پھوٹ اور انتشار ہے۔

۲۴۔ بلاشبہ ہم کمزور اور منقسم ہو گئے ہیں، پس نہ کوشش ہے نہ اتحاد۔ (کمزوری کی وجہ سے کوشش نہیں اور انتشار کی وجہ سے اتحاد نہیں)

۲۵۔ پس مصر میں ہمارا مقام برا ہے۔ اور اغیار کے لیے عمدہ ٹھکانہ ہے۔

۲۶۔ عجب نہیں کہ ہمارے اوپر ہماری راہیں مسدود ہو جائیں۔ اس حال میں کہ ہمارے اکثر سو رہے ہیں۔

عَنْ حَالِ لِسَانِ اللُّغَةِ الْعَرَبِيَّةِ

عنوان نظم ۴: زبان عربی اپنی حالت زار پر شکوہ سنج ہے

۱۔ میں نے اپنے تئیں غور کیا پس مجھے اپنی عقل پر شبہ ہو گیا (کہ کہیں میں ہی غلط راہ پر نہ ہوں) اور میں نے اپنی قوم کو پکارا جب اس نے جواب نہ دیا تو پھر میں نے اپنی زندگی کو اللہ کے حوالے کر دیا۔

۲۔ ان لوگوں نے میرے شباب میں مجھ پر بانجھ ہونے کا الزام لگایا۔ اے کاش! میں (یعنی عربی زبان) بانجھ ہوتی۔ پس میں اپنے دشمنوں کے قول پر بے صبر نہیں ہوتی۔

۳۔ میں نے حسین لڑکیوں کو بند کر دیا۔ (مراد لغات کثیرۃ غریبۃ عجیبۃ) اور جب میں نے اپنی دلہنوں کے لیے ہم کفو لڑکے نہیں پائے تو اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا۔

۴۔ لفظ و معنی کے اعتبار سے میں کتاب اللہ میں وسیع ہوئی۔ قرآن مجید کی آیات اور نصائح میں میرا (دامن) تنگ نہیں۔

۵۔ تو پھر میں آج جدید درآمدات اور نئی اشیاء (ریڈیو، جہاز، ٹیلی ویژن) کے نام رکھنے سے کیوں کر قاصر ہوں۔

۶۔ میں ایک ایسا) سمندر ہوں جس کے بطن میں لولو پوشیدہ ہیں۔ پس کیا ان الزام تراشنے والوں نے میرے غوطہ زنوں اور غواصوں سے میری سیپوں کے متعلق پوچھا؟

۷۔ ہائے افسوس بر حال شما کہ میں (عربی زبان) قدیم ہو گئی اور میرے محاسن پرانے ہو گئے۔ تم میں میرے غمخوار معالج ہیں مگر انھوں نے درماں نہ کیا اگرچہ دوا دشوار ہے۔

۸۔ پس مجھے زمانے کے سپرد نہ کرو۔ مجھے ڈر ہے (اس طرح) اپنی وفات کے قریب ہونے کا۔

۹۔ اہلِ مغرب کے لیے احترام اور قوت ہے۔ کیونکہ قومیں اپنی زبان کی عزت سے معزز ہوتی ہیں۔

۱۰۔ اہل مغرب نے اپنے بولنے والوں کو نئی نئی ایجادیں۔ لغات جدیدہ دیئے۔ کاش تم دیکھ)

کلمات (ہی) تخلیق کرتے۔

۱۱۔ کیا تمہیں مغرب کی طرف سے کوّے کا بولنا اچھا معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرے زمانۂ عروج میں مجھے زندہ درگور کرنے کی اطلاع دے رہا ہے۔

نوٹ:۔ اہلِ عرب کوّے سے بدفال لیا کرتے تھے۔ جب وہ بولتا تھا تو اس کو اڑاتے تھے۔ اگر وہ داہنی جانب اڑتا تو نیک فال لیتے اور اگر بائیں جانب تو شومیٔ فال۔ اس طرح شاعر کہتا ہے کہ اگر وہ غرب کی جانب سے آواز دیتا ہے تو تمہیں اچھا لگتا ہے۔ مراد انگریزی کا تسلّط اور اس کا غلبہ ہے۔

۱۲۔ اور اگر تم اس کوّے کو اڑا کر فال لیتے تو کسی دن تم جانتے کہ اس کے نیچے کیا لغزش اور تفرقے ہیں؟

۱۳۔ جزیرۂ عرب کے بطن میں جو استخوان ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو سیراب کرے کیونکہ ان پر یہ بات) گراں گذرتی ہے کہ میری قامت نرم پڑ جائے۔

۱۴۔ ان استخوانوں نے مصیبت میں مجھ سے پیار کی پاسداری کی۔ اور میں نے بھی ان ہڈیوں سے محبّت کی نگہبانی، اپنے دائمی حسرتوں والے (متاع) قلب وجان سے کی۔ (جبکہ دلِ حزیں سے حسرت وحزن میں نگہبانی بمشکل تمام ہوتی ہے)

۱۵۔ میں نے ان استخوانِ بوسیدہ سے فخر وافتخار میں مغرب کا مقابلہ کیا۔ حالانکہ مشرق اس کے سامنے بوجہ حیا کے سر جھکاتا ہے۔

۱۶۔ میں ہر روز رسالوں میں (الفاظ وعبارت) کی لغزشیں دیکھتی ہوں۔ جو مجھے بلا تاخیر لحد سے نزدیک کرتی ہیں۔

۱۷۔ میں مصر میں انشاء پردازوں (اہل قلم) کے لیے ایک شور سنتی ہوں پس میں سمجھ لیتی ہوں کہ یہ شور مچانے والے میری موت کی خبر دے رہے ہیں۔ (کیونکہ وہ (اہل قلم) ہر روز نئی نئی جدتیں پیدا کرتے ہیں)

۱۸۔ کیا میری قوم مجھے ایسی لغت (زبان) کی طرف چھوڑ دے گی جو رواۃ کے ساتھ متصل نہیں ہے۔

یعنی جس کے راوی متواتر نہیں ہیں۔ (اللہ ان کو معاف فرمائے) مراد جدید عربی ہے۔

۱۹۔ جس طرح فرات کے گھاٹ میں سمِ افعی مل گیا ہو اسی طرح اس لغت میں عجمی آمیزش سرایت کر گئی ہے۔

۲۰۔ پس وہ لغت ستر مختلف رنگوں کے پیوند لگے کپڑے کی مثل ہو گئی ہے

۲۱۔ تمام طبقوں کے مجمع میں ان انشا پردازوں کے گروہ کے سامنے بعداز شکایت میں نے اپنی امید کو ظاہر کر دیا ہے۔

۲۲۔ پس یا تو ایسی زندگانی ہو جو مصیبت میں مرے مُردے کو جلا دے اور قبور میں پڑے ہوئے ریزوں سے (فصلِ گل) اگا دے۔

۲۳۔ یا پھر ایسی ممات ہو کہ اس کے بعد اٹھنا (نشور) نہ ہو۔ اپنی عمر کی قسم ایسی ممات کو جس پر موت کو قیاس نہ کیا جا سکے۔

الفَتَاۃُ الیابانیۃ

عنوان نظم ۵

جاپانی حسینہ

۱۔ جب شمشیر اُچٹ جائے تو، تو میرے ہاتھ کو ملامت نہ کر۔ کیونکہ میرا ارادہ صحیح تھا۔ مگر زمانے نے اس کی درست اندازی سے انکار کر دیا۔

۲۔ بہت سے صاحب بصیرت کوشاں حضرات ایسے ہیں کہ جس چیز کے وہ خواہاں تھے اس میں انھوں نے توفیق (صواب) سے خطا کی۔

۳۔ اگر آزمائش رفعت و شرف کا باعث بنے تو ایسی مصیبت جو مجھے آزمائے، اس کے لیے مرحبا (کیونکہ وہ حصول شرف کا سبب ہے)

۴۔ میرے ساتھ زمانے نے اچّھا سلوک نہیں کیا۔ اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ میں خیر کو فضیلت دیتا ہوں تو میں بھی ادب کے ساتھ اچّھا سلوک نہ کرتا۔

۵۔ یا للاسف اے دنیا! خواہ تو مجھ پر ترش رو ہو یا خندہ زن، میں تیری (ظاہری) چمک بھڑک کو دھوکہ تصوّر کرتا ہوں۔

نوٹ:۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے مَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۔
یہ دنیا ایک دھوکہ ہے۔

۶۔ اگر میرے ساتھ یہ بات نہ ہوتی کہ میری قوم (کے لوگ) مدد چھوڑنے والے ہیں۔ تو میں مصائب کی شکایت کرتے ہوئے رات نہ گذارتا۔

۷۔ وہ ایسی قوم ہے کہ اپنوں سے بغض رکھنے اور اغیار سے پیار کرنے، نے اس کے بازوؤں کو کمزور کر دیا ہے۔

۸۔ وہ القاب سے عشق کرتی ہے اگرچہ بغیر شرف کے (حاصل) ہوں۔ اور مراتب یعنی عہدوں پر اپنی جانیں قربان کرتی ہے۔

۹۔ وہ لہو ولعب سے عشق کرتی ہے۔ اور طاؤس ورباب (گانا بجانا) پسند کرتی ہے۔ حالانکہ (یہ) مصائب اس کو نشانہ بنا رہے ہیں۔

۱۰۔ انگریز قوم کا کھیلنا اس قوم (یعنی میری قوم) کو یا گردش ایام کا اس کے ساتھ کھیلنا، بے پرواہ نہیں کرتا۔

۱۱۔ کاش! کہ وہ میری قوم ایک دردناک قصّہ اور ایک عجیب افسانہ سنے۔

۱۲۔ کہ میں اپنے زمانے میں ایک حسینہ سے محبّت کرتا تھا۔ وہ حسینہ کہ اللہ نے اس کو سب کچھ دیا تھا۔ (یعنی حسن وجمال)

۱۳۔ وہ حسینہ ایک دن میرے لیے ایک خبر لائی۔ اللہ اس خبر کی رعایت نہ کرے یعنی بری خبر لائی۔

۱۴۔ وہ اِٹھلاتی ہوئی آئی اس حال میں کہ رات جوان تھی اور ماہتاب افق آسمان پر خراماں چل رہا تھا۔

۱۵۔ پھر اس نے مجھ سے متبسم دانتوں سے کہا (ایسا لگ رہا تھا کہ گویا) کہ ان دانتوں کے ساتھ گوہر وحباب پرو دیئے گئے ہوں۔

۱۶۔ کیا کہا؟ اس لڑکی نے یہ کہ مجھ کو لوگوں نے جلدی کوچ کر جانے کی خبر دی ہے۔ ایسا کوچ کہ میں اس کے بعد لوٹنا نہیں دیکھتی (یہ لڑکی کا قول ہے)

۱۷۔ مجھے میرے وطن نے پکارا ہے۔ یکاہ نکل جاؤں۔ شاید کہ میں اس چیز کو پورا کر سکوں جو وطن کے لیے میرے اوپر واجب ہے۔

۱۸۔ تب میں نے اس لڑکی سے کہا، اس حال میں کہ مصائب میری روح کے ٹکڑے کر رہے تھے۔ کہ تاسف ہے تجھ پر، ہرن لڑائی میں کیا کریں گے؟

۱۹۔ نہیں پہچانا (جانا) ہم نے اس لڑائی آہو کیلئے چراگاہ کہ غزل اس میں کھیل کود کے خواہاں ہوں۔

۲۰۔ پس اے دوشیزہ! مجھ سے حرب کے بارے میں استفسار کر کیونکہ مجھے اس کا تجربہ ہے اور میں لڑائی میں ہلاکت پر سوار ہوا ہوں، سوار ہونا۔

۲۱۔ اور میں غارت گری کی ہلاکتوں کا شناور ہوں۔ اس حال میں کہ اس غارت گری پر غبار آلود ابر تھا۔

۲۲۔ اور اس حال میں کہ غارت گری (حملے) نے ہمارے لیے ترش رو کیا تھا اس چیز کو جو آنکھوں کے درمیان آسکے۔ یعنی ڈراؤنی شکل بنائی۔ پس میں نے ان آنکھوں کے مابین موت کو ترش رو دیکھا۔

۲۳۔ اور اس حال میں کہ اس (جنگ) کے اطراف، غبار کے نیچے، موت کا فرشتہ (حضرت عزرائیل) بڑی سرعت سے گھوم رہا تھا۔

۲۴۔ پس تو لڑائی لڑنا اس (بہادر) کے لیے چھوڑ دے جو آزمودہ کار ہے اور اے موضع بان کی ہرنی اپنے لیے پردہ لازم کرلے۔

۲۵۔ پس اس نے مجھے گرجدار آواز سے جواب دیا۔ اس آواز سے وہ ہرنی مجھے فربہ گردن والے شیر (کے روپ) میں نظر آئی۔

۲۶۔ میری قوم ہلاکت کے گھاٹ (جنگ) کو شیریں سمجھتی ہے اور تو مجھے اس سے نہ پینے کی دعوت دیتا ہے۔

۲۷۔ میں جاپانی (لڑکی) ہوں۔ اپنے مقصد سے نہیں ہٹوں گی۔ یہاں تک کہ موت چکھ لوں۔

۲۸۔ اگر میں تیر اندازی نہیں جانتی اور اگر میرے دونوں ہاتھ (تلوار) گھمانے کی طاقت نہیں رکھتے

۲۹۔ تو میں زخمیوں کی خدمت کروں گی اور ان کا حق ادا کروں گی۔ اور جو شخص گرے گا یا مجروح ہوگا اس کی غمگساری کروں گی۔

(ڈاکٹر طہٰ حسین، معروف مصری ادیب کے خیالات اقبال کے بارے میں)

ترجمہ: ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی استاد دہلی یونیورسٹی

اقبال اور ابو العلاء معرّی ـــــ ایک تقابلی مطالعہ

ڈاکٹر طہٰ حسین عربی دنیا کے نامور ادیب اور کئی بلند پایہ ادبی اور تنقیدی کتابوں کے مصنّف تھے۔ اقبال کی شاعری کے بارے میں یہاں ان کا نقطۂ نظر پیش کیا جارہا ہے۔ اقبال کی زندگی میں کلام اقبال کی بازگشت عرب دنیا میں نہ ہوسکی۔ اقبال کے انتقال کے بعد ان کے کلام کے منظوم اور منثور عربی ترجمے ہوئے جس کے نتیجے میں عرب کے ادباء اور فن کاروں نے اقبال کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے یہاں اقبال کی نظم ابو العلاء معرّی پر ناظرین کی ضیافتِ ذوق کے لئے پیش کی جارہی ہے ـــــ مترجم

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معرّی　　　پھل پھول پر کرتا تھا ہمیشہ گزر اوقات
اک دوست نے بھونا ہوا تیتر اسے بھیجا　　　شاید کہ وہ شاطر اسی ترکیب سے ہو مات
یہ خوان تر و تازہ معرّی نے جو دیکھا　　　کہنے لگا وہ صاحبِ "غفران" و "لزومات"
اے مرغکِ بیچارہ ذرا یہ تو بتا تو　　　تیرا وہ گنہ کیا تھا یہ ہے جس کی مکافات
افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو　　　دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے　　　ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

اسلامی تاریخ دو سحر بیان شاعروں کو جانتی ہے جن سے اسلامی ادب و شعر کا مرتبہ اوجِ کمال تک پہنچا ہے اور جنہوں نے اس کے حسن میں چار چاند لگائے ہیں۔ ان میں ایک کی نوا عربی اور دوسرے کی عجمی تھی۔ ایک عربی زبان کا معجز نما فنکار تھا ـــــ ابو العلاء معرّی، دوسرا سرزمین ہند و پاک کا سحر طراز شاعر تھا ـــــ محمد اقبال۔

الگ زبانوں، الگ زمانوں اور الگ سرزمینوں کے یہ ممتاز شاعر ایک دوسرے سے بہت

مشابہ ہیں اور دونوں کے درمیان مشترک خوبیاں ہیں۔ اقبال اور معری دونوں عظیم شاعر اور فنکار تھے۔ دونوں بہت بڑے مفکر اور فلسفی تھے اور دونوں عارف حقیقت اور آشنائے طریقت تھے۔ دونوں اتنے بڑے شاعر اور اتنے بڑے فلسفی تھے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ دونوں پہلے شاعر تھے یا پہلے فلسفی تھے اور اگرچہ شعر اور فلسفہ کا وفاق اور ایک کا دوسرے پر انطباق مشکل ہے لیکن دونوں شاعروں نے اپنے فکر و فلسفہ کو شاعری کے سامنے جھکا دیا۔ اور دونوں نے اپنی شاعری کو فلسفہ سے گہرائی اور معنویت عطا کی۔ اسی طرح دونوں شاعر سالک اور صوفی بھی نظر آتے ہیں اور دونوں نے سلوک و تصوف کی روایت سے بغاوت بھی کی۔ اسی طرح دونوں شاعروں نے اپنی شخصیت کا اظہار اور خیال کا ابلاغ باوقار انداز میں کیا ہے۔ دونوں نے ایک مشترک پیغام دیا ہے اور وہ ہے خودی کی رازدانی اور نفس کے عرفان کا پیغام۔ دونوں کا نقطۂ نظریہ ہے کہ خودی کو اس قدر بیدار کر دینا چاہئے کہ وہ مرکز حیات زمانہ افگن اور عہد آفریں ہو جائے۔

اس توارد اور اتحاد کے باوجود دونوں کے یہاں تضاد بھی پہلو بہ پہلو موجود ہے۔ ابوالعلاء معرّی مسلمان زادہ ہوتے ہوئے ہندو مذہب اور فلسفہ کے حسن کا گرویدہ ہے۔ اقبال برہمن زادہ ہوتے ہوئے عربی مذہب و تہذیب کا شیدائی ہے معرّی نے اپنا کعبۂ شوق ہندوستان کو بنایا۔ زندگی بھر اس نے گوشت سے پرہیز کیا اور کسی تارک الدنیا برہمن کی طرح زندگی گزارنے کا آرزومند رہا۔ اقبال کا مرکز محبت اسلامی دنیا تھی۔ عربوں کی محبت اس کے رگ و پے میں اتر چکی تھی۔ اس کے ضمیر و خمیر کا جزو بن چکی تھی۔ عرب کے دیار و امصار کا تذکرہ اس کے اشعار میں ہر جگہ موجود ہے۔ اسے یقین تھا کہ انسانیت کے مرد بیمار کے لئے نسخۂ شفا حکیم عرب کے پاس ہے اور وہی شخصیت قفل انسانیت کی شاہ کلید کی حامل اور ہر زمانے میں صلاح و فلاح کے کام کے لئے عیار کامل ہے۔

اقبال اور ابوالعلاء معری دونوں نے ادراک خودی، شعور ذات یا ایمان بالنفس کا درس دیا ہے لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اس بنیادی اتحاد کے بعد دونوں کی راہیں بدل گئی ہیں۔ ابوالعلاء معرّی کا درس معرفت اس کو سلبیت اور قنوطیت کا شکار بنا دیتا ہے۔ معرفت نفس کی جدوجہد میں وہ خلوت پسند اور علائق بیزار بن جاتا ہے۔ اس کے اندر وہ جمود و خمود پیدا ہو جاتا ہے جو اس کے قویٰ عمل کو معطل کر دیتا ہے لیکن اقبال کے درس خودی نے کوئی ایسا منفی نتیجہ نہیں دکھایا۔ بلکہ اس

کے برعکس وہ حیات آشنا ہونے کی تعلیم دیتا ہے۔ زندگی اس کے خیال میں سرور وبہجت اور نور ونکہت بھی ہے اور ان سے لطف اندوز ہونا ہر شخص کا حق ہے۔ سکون پرستی راہب کا وہ، مخالف ہے۔ ترک دنیا اور فرار وگریز کی راہ اس کی نظر میں غلط ہے۔ فطرت کے تقاضوں کو اور جبلتوں کو وہ ختم کر دینا پسند نہیں کرتا ہے لیکن اس کی زمام وہ فکر سلیم اور طبع مستقیم کے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے۔

ابوالعلا معری کی خلوت گزینی یا معاشرہ بیزاری کا خاص سبب ہے۔ اسے لوگوں سے شکایت ہے کہ وہ خوشامد پسند اور دریوزہ گر ہیں اہل ثروت کے فتراک کا شکار ہیں۔ امراء ورؤسا کے یہاں کاسۂ گدائی لیکر جاتے ہیں اور اپنی خودی کا سودا کرتے ہیں۔ اس احساس کی چوٹ جب غیور اور خوددار شاعر کے دل پر پڑتی تھی تو وہ مضطرب ہو جاتا ہے اور اپنی شاعری کے ذریعہ لوگوں کو توقیر نفس پر آمادہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ لوگوں کو خدا کی صفت یکتائی اور بے نیازی اپنے اندر پیدا کرنی چاہئے۔ سیم وزر کے پیچھے دوڑنے کے بجائے اپنی خودی کی تربیت کرنی چاہئے۔

توحد فان الله ربك واحد

ولا ترغبن فى عشرة الرؤساء

اس کا کہنا تھا کہ ہر شخص کو اپنی شخصیت اور ذات کا ادعان حاصل ہونا چاہئے اور اس ایمان واذعان کے ذریعے سے زمانہ میں سربلند اور نیک نام بننا چاہئے اور قعر مذلت سے نکل کر رفع منزلت کی تلاش کرنی چاہئے۔ اس کی نگاہ میں وہ اصحاب زر ومال اور ملوک وسلاطین جو اپنے شبستانوں میں داد عیش دیتے ہیں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہونے کے سزاوار ہیں اور ان کا وجود سراسر ظلم اور ظلمت ہے۔

ملّ المقام فكم اعاشر امّة

امرت بغير صلاحها امراؤها

ظلموا الرعيه واستجازوا كيدها

وعدوا مصالحها وهم اجراؤها

"عرصۂ حیات تنگ ہو چکا۔ کتنی ہی قومیں ہیں جن کے حکمرانوں نے ان کی صلاح وفلاح سے غفلت برتی۔ انہوں نے اپنی رعیت پر ظلم روا رکھا اور اپنے مکروشر کو جائز سمجھ لیا۔ قوم کے افراد واجزاء ہوتے ہوئے انہوں نے قوم کے مصالح اور مفادات سے روگردانی کی۔"

ابو العلا معری نے پرائے غموں کا شمار کیا ہے۔ اس نے غم جہاں کو غم جاں نہیں بنایا ہے۔ اسے لوگوں کی محرومی کا احساس ہے۔ لیکن احساس کی نشتریت اسے لوگوں سے قریب ہو جانے پر آمادہ نہیں کر سکی۔ بلاخیز موجوں میں سفینے کا وہ ساحل سے تماشائی ہے۔ اس کو اجتماعی زندگی میں سخت ناہمواریاں نظر آتی ہیں۔ لیکن اس نکبت اور ناسازگاری کو دور کرنے کا ولولہ اس کے یہاں نہیں ملتا۔ ابو العلا معری کو گریز پائی اور فراریت ہی میں اپنی عاقبت بخیر نظر آتی ہے اب اس نے ایک منفی اور انتہا پسندانہ اقدام کیا۔ بساط خارزار پر چلنے کے بجائے اس نے گھر کے کنج تنہائی کو رہنے کے لئے منتخب کر لیا۔ زندگی کے پچاس سال اس نے روپوش ہو کر گزار دیئے۔ اس قید اختیار میں آدھی صدی گذر گئی۔

اقبال نے بھی معری کی طرح عرفان خودی اور راز خویشتن آشنائی کی دعوت دی لیکن معری کے برخلاف وہ اس پل صراط پر کامیابی کے ساتھ گامزن رہا۔ اس کی زندگی میں نفی ذات یا نفی حیات کا مقام کبھی نہیں آیا۔ معری نے منفی روش حیات اختیار کر لی لیکن اقبال نے مثبت اور ایجابی طرز زندگی کو قبول کیا۔ اقبال کے عرفان نفس کا نتیجہ جوش خود نمائی اور ذوق آشکارائی کے لباس میں جلوہ گر ہوا۔ خودی کے راز داں ہونے کا یہی قدرتی نتیجہ ہے۔ اور اقبال کا یہی پیغام بھی ہے کہ خودی سے آگاہ ہونے کے بعد انسان عناصر اربعہ اور اقانیم ثلاثہ پر فتحیاب ہو سکتا ہے۔ اقبال کے نزدیک دائرہ اجتماع میں فرد کی اپنی انفرادیت ہی اہم اور مقدم ہے اور اجتماع کی استواری کے لئے لازمی ہے کہ فرد اپنی خودی سے آشنا ہو اور زمانہ میں خود افروز ہو۔ اقبال نے معری کی طرح یہ پیغام دیا ہے کہ انسان کو سربزیری اور انکسار سے اپنے دامن کو بچانا چاہیے۔

اقبال بایں ہمہ تعلیم خودی اجتماعیت کا منکر نہیں ہے وہ جتنا زیادہ فرد پسند اور خودی آموز ہے اتنا ہی وہ اجتماعت کی اہمیت کا بھی قائل ہے اقبال معلم اور رہنما ہے، اسلامی دنیا اور تمام ربع سکونت کے انسانوں کے لئے وہ ایک درد مند پیغامبر ہے۔ اس کی یہ حیثیت اس کے اجتماعی احساس کی کافی دلیل ہے لیکن اقبال کے خیال میں وہ مثالی اجتماعیت جس میں ہر انسان دوسرے انسان کے لئے خدمت، خلوص اور خیر خواہی کا جذبہ رکھے اس وقت تک وجود میں نہیں آ سکتی ہے جب تک کہ فرد خود اپنی خودی سے آشنا اور اپنے کمالات سے باخبر نہیں ہو جاتا ہے۔ فرد کے لئے باہمہ اور بے ہمہ ہونا ضروری ہے۔ وہ اجتماع کی ہیئت ترکیبی کا عامل بھی ہے اور معمول بھی

ہے۔اگر جزو کا تصور کل کے تصور کے بغیر بے معنی ہے تو کل بھی اپنے وجود کے لئے جزو سے بے نیاز نہیں ہے اس لئے فرد کا خودی سے بے زار اور اپنے تشخص سے دست بردار ہونا خود اجتماع کے لئے غیر مفید ہے۔ فرد کو لازم ہے کہ وہ با اختیار وجود خودی پر یقین کرے اور یہ سمجھے کہ خیر و برکت کے جو کام وہ دنیا میں تمام کرنا چاہتا ہے ان کا سرچشمہ اس کی اپنی ارادت اور مشیت ہے۔اسی کے اختیار سے روشنی کی کرن طلوع ہوتی ہے اور بزم حیات کو روشن کرتی ہے۔ اس کی ذات اس شمع فروزاں کے مانند نہیں ہے جس کی ضیا پاشی خود اس کے اختیار سے نہیں ہوتی اس کی ضیا گستری اس ذات حق کی تخلیق نور کا عکس ہے جو اپنے ارادہ مطلق سے زمین و آسمان اور سارے جہاں کو منور کرتا ہے۔

اقبال کے نقطہ نظر سے فرد کا جماعت سے انفکاک یا گریزاں ہونا صحیح نہیں ہے اس کو اپنی انفرادیت کو باقی رکھتے ہوئے جماعت سے وابستہ و پیوستہ رہنا چاہئے۔اس کے نزدیک جو معیار خوبی فرد کیلئے تھا وہی معیار جماعتوں کے لئے تھا۔جس طرح خودی کی نگہداری سے ربط و ضبط کا انکار لازم نہیں آتا اسی طرح جماعتوں کا الگ الگ وجود انتشار کو مستلزم نہیں ہے۔اقبال کا نقطہ نظر افراد و انجمنوں کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔ وہ جماعتوں کے درمیان اتحاد و اعتماد اور تعاون و اشتراک کی روح کو طاقت ور دیکھنا چاہتا ہے تاکہ اس وحدت کی بنیاد پر ایسی ملت کی تشکیل ہو سکے جس کا نفع و نقصان ایک ہو۔ تکلیف و آرام ایک ہو اور مفاد و مقصد ایک ہو اس لئے اقبال نے بالخصوص برصغیر کے مسلمانوں اور نژادنو کو مخاطب کیا اور کہا کہ رنج و راحت اور غرض و غایت کی یکسانیت ان کے لئے وہ بنیاد ہے جس پر ان کی اجتماعی اور سیاسی زندگی کی عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے ان کو قوت و شوکت سے آشنا، دنیا میں ممتاز اور حامل اعزاز ہونا چاہئے۔ان کے پاس تمام مخلوق کی نفع رسانی کا پروگرام اور تعاون و تضامن کا نظام موجود ہونا چاہئے۔جاہل اور حقیقی اقدار سے غافل لوگوں کے پاس راز حقیقت کا حامل بن کر پہنچنا چاہئے۔

اقبال نے خودی کا درس دیا۔اقبال نے مخلوق کو اخلاق الہی کے پھولوں سے اپنی قبائے انسانیت کو آراستہ کرنے کی تعلیم دی۔اقبال کا پیغام جہانبانی اور جہاں گیری کا پیغام ہے۔اقبال کا آئیڈیل ایک انسان کامل ہے چونکہ اس سے ملتی جلتی باتیں نطشے نے بھی کہی ہیں اسلئے ان انگریزوں کو جنھوں نے کلام اقبال کا مطالعہ نکلیسن کے ترجمے کے واسطے سے کیا ہے یہ شبہ ہوا کہ اقبال کا فکرو

فلسفہ نطشے کے فکر و فلسفہ سے ماخوذ ہے۔ اور اقبال کا انسان کامل نطشے کے آئیڈیل انسان کی شبیہ ہے۔ اقبال نے جب انسان کامل کا تصور پیش کیا تھا اس وقت وہ نطشے کے فلسفہ سے ناآشنا تھے اس لئے یہ الزام صحیح نہیں ہے۔ جب اقبال ادب و شاعری اور فلسفہ کے سفر میں ایک طویل مسافت طے کر چکے تھے تب جاکر مغربی فلسفہ کا ان کو علم ہوا تھا۔

بہرحال حقیقت یہ ہے کہ اسلامی شاعری کے طویل دور میں یہ دو برگزیدہ شاعر شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ معری اور اقبال ــــ نہ ابوالعلاء معری سے پہلے اس رتبہ کے شاعر کی نظیر پیش کی جاسکتی ہے اور نہ معری اور اقبال کے درمیانی عہد میں اس معیار کا کوئی شاعر ہے جس سے ہم واقف ہیں۔ معری اور اقبال کی شاعری میں جو سطوت آہنگ جلال و جمال اور امتزاج فکر و فن ہے اس سے اسلامی شاعری کا نام روشن اور بلند ہے معری کے بعد اسلام کو مدتوں سے ایسی شخصیت درکار تھی جو بلند مرتبہ شاعر مفکر اور رہنما ہو۔ عالم اسلام کو اقبال کی صورت میں یہ شاندار شخصیت مل گئی۔ اقبال اپنے پیش رو شاعر سے زیادہ خوش نصیب تھے۔ معری نے جس زمانے میں آنکھیں کھولیں وہ مسلمانوں کے عہد زوال کا آغاز تھا عجمی اور ترکی عنصر کی عالم اسلام پر گرفت مضبوط ہو رہی تھی۔ اقبال مند مغرب مشرق کو تاخت و تاراج کرنے کے لئے تیاریاں بلکہ پیش قدمیاں کر رہا تھا مسلمانوں کا حال اس دیوار کہن سال اور زبوں حال کی طرح تھا جو لطمہ موج کی تاب نہ لاسکتی ہو مستقبل سے ہراس اور رحمت خداوندی سے یاس کی کیفیت پھیل رہی تھی۔ اس وقت معری نے بیداری کا پیغام دیا اور کہا کہ خدا کسی "مابقوم" کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک لوگ "ما بانفس" میں تبدیلی نہ کریں۔ اقبال کے عہد میں بھی جیسا کہ ہم حال کے آئینہ میں دیکھتے ہیں مسلمانوں کی وحدت کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔ وہ تنزل کی پستی میں تھے حالانکہ تقاضا تھا کہ وہ اتحاد و استحکام پیدا کریں لیکن فرق یہ تھا کہ اب تاریکی میں روشنی کی کرنیں نمودار ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ مسلمان غفلت شبانہ سے بیداری کی کروٹیں لے رہے تھے اور نئی زندگی کے آثار نظر آرہے تھے۔ خزاں رسیدہ چمن اب بہار آشنا ہونے کو تھا لیکن دوسری طرف مسلمانوں کے دشمن اور رہزن بھی تھے اور ان کا مکر و شر اسلام کے خلاف جاری تھا۔ غنیم کا یہ لشکر عدو مغربی سامراج کی صورت میں ظاہر ہوا تھا اسی طرح سے دونوں کا تاریخی پس منظر بھی بعض اعتبار سے ایک جیسا ہے اور بعض اعتبار سے بالکل جداگانہ نوعیت کا ہے۔ اقبال کے تاریخی پس منظر کے جلو میں علوم مغرب کا لشکر ہے اور پیش گاہ الٰہی

سے اسے اس کا موقع دیا گیا تھا کہ وہ ان علوم پر دستگاہ حاصل کر سکے۔ وہ تہذیب مغرب کا سب سے بڑا داشناس تھا۔ مبدء فیاض کی طرف سے اسے ژرف نگاہی اور نقد و نظر کی بیش بہا دولت ملی تھی جس سے معری کا دامن خالی تھا۔ اقبال نے جدید تہذیب و تمدن کا تجزیہ کیا اور ایک ماہر صراف کی طرح اس کے کھوٹے اور کھرے اجزاء کو الگ الگ کر دیا۔

اقبال اور ابو العلاء معری دونوں نے چونکہ خودی کی بیداری اور نگہداری کی تعلیم دی ہے۔ اس سے دونوں شاعروں نے فلسفہ عینیت اور حلول و اتحاد کی مخالفت کی ہے اور دونوں اس فلسفہ کے ناقد و معترض رہے ہیں۔ بعض اہل تصوف کا یہ اعتقاد کہ خودی کو خدائی میں گم کر دینا چاہیئے تاکہ عبد، عبد نہ رہے۔ اللہ اللہ ہو جائے۔ دونوں شاعروں کے لئے برہمی کا باعث ہے۔ ابو العلاء معری کا صوفیا سے مناقشہ ایک معروف بات ہے۔ اقبال نے بھی نور خودی کو جلوہ خدائی میں معدوم کر دینے سے انکار کیا ہے۔ فنائیت حلول یا داصل بحق ہو جانے کے نظریہ کے مقابلہ میں اقبال کا فلسفہ خودی زیادہ وزنی ہے اس لئے کہ خدا نے بندگی کا مطالبہ کیا ہے۔ خودی کو فراموش کر دینے کا مطالبہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس اس نے حریت ضمیر اور استقلال کی حفاظت کا حکم دیا ہے۔ خدا نے مخلوق کو نماز و روزہ، زکوٰۃ و حج کا مکلف قرار دیا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ مکلف کرنے کا راز یہ ہے کہ عبد اور معبود کے درمیان کا فاصلہ بھی باقی رہے اور دونوں کے درمیان رابطہ بھی برقرار رہے۔ مخلوق کو اپنی آزادانہ مستقل حیثیت کے ساتھ اپنے خدا کے سامنے نیاز بندگی اور احکام کی بجا آوری کرنی چاہیئے۔

اقبال اور ابو العلاء معری کی شاعری میں ایک اور بے ساختہ اور حیرت افزا توارد یا اتفاق نظر آتا ہے اور وہ کتاب الٰہی کا "اسراء" کا وہ مہتم بالشان واقعہ ہے جس سے دونوں شاعر یکساں متاثر نظر آتے ہیں۔ دونوں شاعروں کے خیال میں معراج یا "اسراء" کے واقعہ کے اندر انسان کیلئے بامعنیٰ اور خیال انگیز درس حیات موجود ہے، معراج کا واقعہ ان قوتوں کی غمازی کرتا ہے جو انسان کے باطن میں مستور ہیں۔ اس کی عقل ندرت کوش ہر ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے۔ دنیا کی فضا انسان کی تگ و تاز اور قوت پرواز کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس کا جوہر انسانیت اور حوصلہ بلند ہمیشہ جہان نو کی یافت اور ہر نامعلوم کی دریافت کے لئے سرگرم اور سرگرداں رہتا ہے۔ دونوں شاعروں نے اس واقعہ کی صرف تشریح اور رمز کشائی نہیں کی بلکہ عالم خیال میں معراج بھی حاصل کی چشم تصور کو باز کر کے آسمانوں

کی سیر کی اور جنت و جہنم کو دیکھا۔ ابوالعلاء معری نے اس سیر و سفر کی روئداد "رسالۃ الغفران" میں بیان کی ہے۔ اقبال نے بھی افلاک سماوات کا سفر کیا، مریخ و قمر پر اس کا گذر ہوا۔ جنت و جہنم اور مقام اعراف کی زیارت کی۔ انہوں نے اس ماورا دنیا کے سفر میں جلال الدین رومی کو اپنا رہبر بنایا۔ مشہور شاعر دانتے نے بھی اپنے مابعدالحسیاتی سیاحت کا حال لکھا ہے۔" دانتے" نے لاطینی شاعر ورجل کو اپنا ہمسفر بنایا تھا لیکن قرینہ یہ ہے کہ اقبال اپنی زندگی کے دور آخر میں دانتے سے آشنا ہوئے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر جگہ کی طرح یہاں بھی اقبال اور معری کا مشترک تاثر دیرا اور دور تک برقرار نہ رہ سکا۔ دونوں شاعر جب فردوس بریں سے کرہ زمین پر اترے تو ایک کے لبوں پر استہزا اور استخفاف تھا اور قریب تھا کہ اس کے عقیدہ کا شیشۂ نازک پاش پاش ہو جائے۔ یہ ابوالعلاء معری تھا لیکن دوسرے شاعر کا سینہ سوز عشق سے آشنا اور یقین کے نور سے معمور تھا۔ اس نے علم الیقین سے عین الیقین تک کے تمام مرحلہائے سفر طے کر لئے تھے۔ اس کا بس چلتا تو اب وہ اپنے شرار ایمان کی تنویر سے زندگی کی شب تاریک کو روشن کر دیتا ——— یہ دور جدید کا شاعر محمد اقبال تھا۔

محمد بدیع الزماں
ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، پھلواری شریف پٹنہ

"بالِ جبریل" کی نظم "ذوق وشوق"

ایک مطالعہ

تمہید

اقبال نے اس نظم کا نام "ذوق وشوق" رکھا ہے۔ الفاظ سے مشتق اقبال کی خود وضع کردہ سیکڑوں اصلاحوں میں یہ دو الفاظ بھی ہیں جن سے بہت سارے اشعار ہیں۔ مگر اقبال نے انھیں جہاں بھی استعمال کیا ہے ایمان ویقین کی باتوں کو ذہن نشین کرانے کے لیے ہی کیا ہے۔ "ذوق" کے تو ایسے لفظی معنی مزہ چکھنا ہے مگر فارسی زبان میں بمعنی لذّت ومزہ ونشاط وخوشی کے مستعمل ہے۔ مگر اقبال کے یہاں اس کے اصطلاحی معنی رغبت اور کشش کے لیے گئے ہیں "شوق" کے لغوی معنی آرزومند کرنا یا خواہش دل کی یا کسی چیز کی طرف مشتاق ہونا ہے مگر اقبال کے یہاں اس کے اصطلاحی معنی "جذبۂ عشق" ہے۔ یہ جذبہ ایک مردِ مومن کے حوصلے بڑھاتا، اسے جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تیار کرتا اور راہِ حق میں سرفروشی اور آتش نمرود میں بے خطر کود پڑنے کی ترغیبات اجاگر کرتا ہے جو صفات کہ فرشتوں تک میں نہیں گرچہ حمد وثنا دونوں کرتے ہیں۔ بقول اقبال، جو "بالِ جبریل" کی غزل ۴ (اوّل) میں خدا کو مخاطب فرماکر کہتے ہیں ؎

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انھیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

اس جذبہ کی بدولت ایک مردِ مومن اللہ کی راہ میں لگ کر تخلیقِ انسانی اور تخلیقِ کائنات کے مقاصد کو پورا کرتا ہے۔ اقبال کا یہ شوق "نغمۂ اللہ ہو" کے مترادف ہے۔ اس جذبے کو خود پر محمول کرتے ہوئے "بالِ جبریل" کی نظم "مسجدِ قرطبہ" کے تیسرے بند کے آخری شعر میں کہتے ہیں؎

شوق مری لَے میں ہے شوق مری نَے میں ہے
نغمۂ اللہ ہُو، میرے رگ وپے میں ہے

چونکہ مصداق سورہ آلِ عمران ۳۔آیات ۳۱ اور ۳۲ "نغمۂ اللہ ہو" اُمّتِ محمدیؐ کے لیے صرف عشقِ رسول میں مضمر ہے اور یہ اسی عشق کی بدولت نغمہ سنج ہوتا ہے اس لیے اس نظم کے چوتھے بند کے چوتھے شعر میں اقبال یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ اگر عشقِ رسولؐ یعنی اتباعِ رسولؐ کا جذبہ ارکانِ شریعت کی بجاآوری میں محرک نہ ہو تو کوئی عبادت خدا کی بارگاہ میں مقبول نہیں ہوسکتی۔

الغرض ان دونوں اصطلاحوں "ذوق" اور "شوق" کے اجتماع سے عشقِ رسولؐ میں شدّتِ محبّت کا اظہار مقصود ہے۔ ذکر اللہ بتوسطِ رسولؐ کرتے کرتے جب سالک پر محویت کا عالم طاری ہوجاتا ہے تو اسی کی کیفیت کو تصوّف کی اصطلاح میں "ذوق وشوق" سے تعبیر کرتے ہیں۔ چونکہ یہ نظم دراصل نعتِ رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلّم ہے اور اس کا ہر شعر عشقِ رسول میں ڈوبا ہوا ہے اس لیے اقبال جیسے عاشقِ رسولؐ کے لیے اس سے بہتر عنوان نہیں ہوسکتا تھا۔

اقبال نے اس نظم کے زیرِ عنوان قوسین میں لکھا ہے کہ: "ان اشعار میں سے اکثر فلسطین میں لکھے گئے"۔ سائمن کمیشن کی سفارشات کے تحت حکومتِ برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کو آئینی مراعات دیے جانے کے لیے لندن میں بلائی گئی۔ دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد دسمبر ۱۹۳۱ء میں واپسی میں اٹلی اور مصر ہوتے ہوئے مفتیٔ اعظم سیّد امین الحسینی کی دعوت پر مؤتمر عالمِ اسلامی کے جلسہ میں شرکت کی غرض سے اقبال فلسطین گئے تھے جہاں اُن کا قیام، دسمبر ۱۹۳۱ء سے آٹھ دن رہا۔ اس نظم کے اکثر اشعار انھیں آٹھ دنوں میں لکھے گئے۔ اس جلسہ میں اور باتوں کے علاوہ مؤتمر کے عہدیداروں کا بھی انتخاب ہوا۔ مفتیٔ اعظم تو صدر منتخب ہوئے اور چار نائب صدور میں ایک اقبال کا بھی انتخاب کیا گیا۔

اقبال نے اس نظم کو شروع کرنے سے قبل شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا شعر نقل کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اقبال ہمارے لیے یہ نظم قبلۂ اوّل کے اس مبارک خطّہ سے بطور سوغات لائے ہیں کیونکہ بیت المقدّس کی حاضری کے بعد اس سے بہتر تحفہ نہیں ہو سکتا تھا۔

اس نظم میں پانچ بند ہیں اور ہر بند میں چھ اشعار ہیں۔ اب آگے ہر بند کے ہر شعر پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

پہلا بند

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں　　چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں
حسنِ ازل کی ہے نمود، چاک ہے پردۂ وجود　　دل کیلئے ہزار سود، ایک نگاہ کا زیاں
سُرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب　　کوہِ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں
گرد سے پاک ہے ہوا، برگِ نخیل دھل گئے　　ریگِ نواحِ کاظمہ نرم ہے مثلِ پرنیاں
آگ بجھی ہوئی اِدھر، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر　　کیا خبر اس مقام سے گذرے ہیں کتنے کارواں
آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی
اہلِ فراق کے لیے عیشِ دوام ہے یہی

اس بند کے پہلے شعر میں اقبال نے حوالیٔ یثرب میں صبح کا سماں باندھا ہے اور بطور تمہید اسے "قلب و نظر کی زندگی" سے تعبیر کرتے ہوئے استعارے کے طور پر اس زندگی کو "دشت میں صبح کا سماں" سے موسوم کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ عشقِ رسولؐ میں گرویدگی بغیر "عفّتِ قلب و نگاہ" کے ممکن نہیں۔ صرف اس شعر یا اس بند ہی کو نہیں بلکہ پوری نظم کو گرفت میں لانے کے لیے "قلب و نظر کی زندگی" کی ترکیب قدرِ تشریح طلب ہے کیونکہ پوری نظم اسی محور پر گردش کرتی ہے۔

"قلب و نظر کی زندگی" سے اقبال کی مراد روحانیت، تقویٰ اور پاکیزگی کی زندگی ہے۔ قلب وہ قوتِ وجدان ہے جو حواسِ خمسہ سے بے نیاز ہوتی ہے اور اس قوّت کے ثمرہ کو اقبال نظر سے تعبیر کرتے ہیں۔ قلب و نظر کی زندگی سے ایک انسان تجلّیاتِ حُسن کی شدّت میں سراپا غرق ہو کر ماسوا سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ "بالِ جبریل" کی غزل ۳ (اوّل) میں اقبال خدا کو مخاطب بنا کر کہتے ہیں ؎

گیسوئے تابدار کو اور بھی تاب دار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

دل اس کائنات میں سب سے بڑی قوّتِ محرّکہ ہے اور لامحدود توانائی کا خزانہ بھی۔ مگر خدائے تعالیٰ نے دل کو نگاہ کا تابع بنایا ہے۔ پس اگر انسان دل کی پاکیزگی کا آرزومند ہے تو پہلے اُسے اپنی نگاہ کے اندر پاکیزگی کا رنگ پیدا کرنا ہوگا۔ یہی صلاح اقبال نے "بالِ جبریل" کی غزل ۵۵ کے درج ذیل شعر میں دیا ہے ؎

نگاہ پاک ہے تیری تو پاک ہے دل بھی
کہ دل کو حق نے کیا ہے نگاہ کا پیرو

اور پھر اقبال نے اس نکتہ کی مزید تشریح "ارمغانِ حجاز" کی نظم "آوازِ غیب" میں اس طرح کرتے ہیں ؎

روشن تو وہ ہوتی ہے جہاں بیں نہیں ہوتی
جس آنکھ کے پردوں میں نہیں ہے نگہِ پاک

عفّتِ قلب و نگاہ، جو منجملہ خصوصیات اسلام ہے، صرف شانِ فقر سے پیدا ہو سکتی ہے، اور شانِ فقر موقوف ہے عشقِ رسولؐ پر اور یہ دونوں اقبال کے فلسفہ میں مترادف اصطلاحیں ہیں۔ بمصداق اس حدیث کے کہ ایک صحابی رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: "یا رسول اللہ مجھے آپ سے محبّت ہے۔" حضورؐ نے فرمایا: "دیکھ کیا کہتا ہے۔" انھوں نے پھر یہی عرض کیا کہ "مجھے آپؐ سے محبّت ہے۔" حضورؐ نے پھر یہی ارشاد فرمایا۔ جب تین مرتبہ سوال و جواب ہوا تو حضورؐ نے فرمایا:

"اگر تم اپنی بات میں سچّے ہو تو فقر کو اوڑھنے بچھانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس لیے کہ مجھ سے محبّت رکھنے والوں کی طرف فقر ایسے زور سے دوڑتا ہے جیسا کہ پانی اونچان سے دوڑتا ہے۔" ("حیاتِ صحابہؓ"۔ "فضائل اعمال")

فقر کی غایت یہ ہے کہ قلب و نظر دونوں گناہ یعنی اللہ کی نافرمانی سے محفوظ ہو جائیں ــــ "بالِ جبریل" کی غزل ۵۹ کے درج ذیل شعر میں اقبال فقر کی غایت "عفّتِ قلب و نگاہ ہی بتاتے ہیں ؎

علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفّتِ قلب و نگاہ

چنانچہ "قلب ونظر کی زندگی" کو شانِ فقر پر محمول کرتے ہوئے اقبال "بال جبریل" کی درج ذیل رباعی میں مسلمانوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ اگر تم خود میں ایمان کا رنگ پیدا کرنا اور دنیا میں سربلندی حاصل کرنا چاہتے ہو تو خدا سے شانِ فقر یعنی "قلب و نظر کی زندگی" کے حصول کی دعا کرو جو اسلاف کا طرۂ امتیاز تھا کیونکہ یہ ساری دولت بغیر فقیری کو اپنی زندگی کا جزو وکل بنائے حاصل نہیں ہو سکتی:-

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری
رہا صوفی گئی روشن ضمیری
خدا سے پھر وہی قلب ونظر مانگ
نہیں ممکن امیری بے فقیری

اقبال کے نزدیک "قلب ونظر کی زندگی" کی اہمیت خدائے تعالیٰ کے ارشادات اور رسول اللہ کی تعلیمات سے ماخوذ ہے۔ خدائے تعالیٰ نے انسان کو سوچنے کے لیے عقل نہیں دیا ہے۔ جس کے لیے قرآن میں "اَلْاَفْئِدَۃ" کا لفظ وارد ہوا ہے۔ یہ کہ دل سوچنے کے لیے دیا گیا ہے اسے قرآن مجید میں تین بار تین مختلف مواقع پر ذہن نشین کرایا گیا ہے۔ پہلی بار سورۃ النحل ۱۶ کی آیت ۷۸، میں، دوسری بار سورۃ المومنون ۲۳ کی آیت ۷۸ میں اور تیسری بار سورۃ الملک ۶۷ کی آیت ۲۳ میں۔ ان تینوں آیات میں الفاظ کے تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ قلب ونظر عطا کئے جانے کی غایت یہ فرمائی گئی ہے کہ:-

"اس نے تمہیں کان دیئے، آنکھیں دیں اور سوچنے والے دل دیئے، اس لیے کہ تم شکر گزار ہو"

اور پھر سورۃ الحج ۲۲ کی درج ذیل آیت ۴۶ میں ارشاد ہے:-

"حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر دل اندھے ہو جاتے ہیں جو

سینوں میں ہیں۔"

اسی لیے اقبال نے اسی آیت کے پیشِ نظر "بال جبریل" کی غزل ۲۰ کے درج ذیل شعر میں مسلمانوں کو صلاح دی ہے کہ ؎

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

"انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ فاسد ہوجائے تو سارا جسم فاسد ہوجاتا ہے۔ اور اگر اس کی اصلاح ہوجائے تو سارے جسم کی اصلاح ہوجاتی ہے۔ آگاہ ہوجاؤ کہ وہ قلب ہے۔" (مشکوٰۃ شریف)

جہاں تک نظر کا سوال ہے اقبال نے اسے عشق ہی کے عشوہ طرازیوں کے باب میں استعمال کیا ہے۔ "ارمغانِ حجاز" کی نظم "تصویر و مصوّر" میں تصویر کی زبان پر یہ شعر رکھا ہے جس میں اقبال نظر کو "دل کی حیاتِ جاودانی" سے موسوم کرتے ہیں ؎

خبر، عقل و خرد کی ناتوانی
نظر، دل کی حیات جاودانی

"خبر" اور "نظر" الفاظ سے مشتق اقبال کی دو مخصوص اصطلاحیں ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ خبر کا سرمایہ اقبال کے فلسفہ میں تمام تر وہ معلومات ہیں جو حواس خمسہ سے حاصل ہوتی ہیں اور نظر کا سرمایہ یقین ہے جو صرف عشق کی بدولت حاصل ہوتا ہے اور جس کا سرچشمہ دل ہے۔ اقبال کے نزدیک خدا کی محبت "شنید" نہیں بلکہ "دید" ہے۔ یعنی وہی شخص خدا سے محبت کرسکتا ہے جو خدا کے حسن کا ذاتی احساس رکھتا ہو۔ اقبال اسی لیے "شنید" کے لیے "خبر" اور "دید" کے لیے "نظر" کی اصطلاحیں لاتے ہیں۔ عقل فقط خبر مہیا کرتی ہے لیکن باخدا لوگوں کی محبت (مراد عشق رسولؐ ہے) اور صحیح قسم کے نظریاتی ماحول سے "نظر" حاصل ہوتی ہے۔

اقبال مسلمانوں کو جس نظر کو پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں اسے انھوں نے "بانگ درا" کی

نظم "طلوعِ اسلام" میں "براہیمی نظر" کا نام دیا ہے مگر اس کے لیے جگر کو خون کرنا پڑتا ہے۔ اس نظم کے دوسرے اور پانچویں بندوں میں علی الترتیب کہتے ہیں:۔

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی | جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
براہیمی نظر پیدا ذرا مشکل سے ہوتی ہے | ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

الغرض "قلب و نظر" کی مقصدیت بُرار مغانِ حجاز" کی نظم "مسعود مرحوم" میں اقبال کہتے ہیں ؎

دل و نظر بھی اسی آب و گل کے ہیں اعجاز
نہیں تو حضرت انساں کی انتہا کیا ہے؟

اس پہلے شعر میں جب اقبال "قلب و نظر کی زندگی" کو "دشت میں صبح کا سماں" سے تعبیر کرتے ہیں تو ساتھ ہی "چشمۂ آفتاب سے نور کی ندّیاں رواں ہونے کی بھی بات کہتے ہیں۔ یہاں "چشمۂ آفتاب" سے مراد رسول اللہ کا "چشمۂ فیضان" ہے۔ جس کی بدولت حوالیٔ یثرب میں ظلمت کی جگہ نور یعنی روحانیت کا چشمہ جاری ہے۔

اس بند کے دوسرے شعر میں اقبال یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ جب تک نگاہ مصروفِ نظارہ رہتی ہے۔ بصیرت یعنی دل کی قوّت منکشف نہیں ہوتی۔ اس لیے روحانی ترقی کے لیے خلوت اختیار کرنے سے نگاہ بیشک لطفِ نظارہ سے محروم ہو جاتی ہے لیکن اس سے دل زندہ ہو جاتا ہے۔ یعنی فکر میں قوّتِ تخلیق پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی نکتہ کے لیے اقبال "ایک نگاہ کا زیاں" لاتے ہیں۔

چونکہ اس نظم کے مطالعہ کے وقت مدینۃ النبی کے گرد و نواح کا تصوّر ذہن میں رکھنا ضروری ہے اس لیے اس بند کے تیسرے اور چوتھے اشعار میں اقبال نے وہ منظر پیش کیا ہے جہاں رات کی بارش کی وجہ کر صبح کے وقت آفتاب کے طلوع ہونے پر اس کی شعاعوں سے بادلوں کے ٹکڑے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کسی نے کوہِ اضم کو سُرخ اور نیلی چادر پہنا دی ہو۔ بارش کی وجہ کر ہوا بالکل صاف ہو گئی ہے اور درختوں کے پتّے بھی دُھل گئے اور نواح کاظمہ کا ریت

ریشم کی طرح چمکنے لگا۔ ان اشعار میں بھی اقبال نے بلاواسطہ عشقِ رسول میں گرویدگی کی وجہ کر انسان کے نفس اور قلب ونظر پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں انھیں رات، بارش، بادلوں کا چھٹ کر سرخ وکبود بدلیاں چھوڑ جانا، ہوا کا پاک ہونا اور پتوں سے گرد کا دھل جانا اور نواحِ کاظمہ کے ریت کا ریشم کی طرح چمکنے لگا جیسے استعارے استعمال کیا ہے۔ اقبال نے ان اشعار میں کوہِ اضم اور نواحِ کاظمہ کا ذکر کیا ہے۔ اضم مدینہ منوّرہ کے نواح میں ایک پہاڑی ہے اور کاظمہ مدینہ منوّرہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اقبال نے یہ دونوں الفاظ عرب کے مشہور قصیدہ بردہ کے دوسرے شعر سے مستعار لیا ہے جو شعر درج ذیل ہے ؎

اَمْ ھَبَّتِ الرِّیْحُ مِنْ تِلْقَآءِ کَاظِمَۃٍ
وَاَوْمَضَ الْبَرْقُ فِی الظَّلْمَآءِ مِنْ اِضَمٖ

یعنی مقامِ کاظمہ کی طرف سے محبت کی ہوا چل پڑی یا موضع اضم کی سمت سے تاریکی میں بجلی کوندی۔

پانچویں شعر میں اقبال اس وقت کی یاد دلاتے ہیں جب رسول اللہ کی قیادت میں مسلمانوں نے سرزمین مدینہ میں شمع رسالت روشن کی اور آپ کی سربراہی میں اسلام کی تاریخی جنگیں لڑی گئیں جو اسلامی حکومت کے قیام کا باعث بنیں۔

اس بند کے آخری اور چھٹے شعر میں اقبال ہاتف غیبی بن کر مسلمانوں کو درس دیتے ہیں کہ مسلمانوں کا اصل مقام عشقِ رسول میں گرویدگی ہے اور یہ کہ عشق کا سارا نظام فراق پر مبنی ہے نہ کہ وصال پر کیونکہ پھر عشق ختم ہو جاتا ہے۔

دوسرا بند

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لیے مئے حیات — کہنہ ہے بزمِ کائنات، تازہ ہیں میرے واردات
کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں — بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات
ذکرِ عرب کے سوز میں، فکرِ عجم کے ساز میں — نے عربی مشاہدات، نے عجمی تخیلات
قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں — گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق　　عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؑ بھی ہے عشق

معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اس بند میں بظاہر اقبال اپنی قلبی واردات کا بیان کرتے ہیں مگر درپردہ وہ اپنے محبوب رسول اللہؐ سے مخاطب ہو کر ملّت اسلامیہ کی زبوں حالی پر یہ کہہ کر آنسو بہاتے ہیں کہ: "زہر ہے میرے لیے مے حیات"۔ اقبال ساری زندگی مسلمانوں کی بے حسی، بے عملی اور ضعف ایمانی پر گریاں کناں رہے چنانچہ کچھ سالوں بعد ہی "ضربِ کلیم" کی نظم "اے روحِ محمدؐ" میں رسول اللہ کو مخاطب بنا کر پھر اپنی اُسی قلبی واردات کا ذکر کیا ہے جو اس نظم "ذوق و شوق" کے اس دوسرے بند میں ہیں۔ مسلمانوں کی زبوں حالی پر اقبال کے قلبی ہیجان کا اندازہ لگانے کے لیے اس نظم کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے جو ذیل میں نقل کی جارہی ہے:۔

شیرازہ ہوا ملّتِ مرحوم کا ابتر　　اب تو ہی بتا، تیرا مسلمان کدھر جائے

وہ لذّتِ آشوب نہیں بحرِ عرب میں　　پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے

ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد　　اس کوہ و بیاباں سے حُدی خوان کدھر جائے

اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ

آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

اس نظم "ذوق و شوق" کے اس دوسرے بند کے پہلے شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبال نے اپنی قلبی واردات کا ذکر کیا ہے اور دوسرے مصرعہ میں یہ بات ذہن نشین کرائی ہے کہ گرچہ یہ دنیا پرانی ہو گئی ہے مگر میرے احساسات بالکل تازہ ہیں۔ اقبال کا مطلب یہ ہے کہ میں گذشتہ اقوام کی بربادی کا تذکرہ نہیں کر رہا بلکہ موجودہ مسلمان قوم جن آفات میں مبتلا ہے اس پر گریہ کناں ہوں۔

دوسرے شعر میں اقبال نے "غزنوی" اور "سومنات" کی اصطلاحیں لائی ہیں۔ میرے مطالعہ کے مطابق اقبال کے کلام میں شخصیتوں سے منسوب ایک سو پچاس اور جغرافیائی ۶۵ اصطلاحات

ہیں۔ اس بند میں اوّل الذکر سے "غزنوی" "خلیلؑ" اور "حسینؓ" اور مؤخرالذکر سے "سومنات" "حجاز" "دجلہ" "فرات"، "بدر اور حنین" کی اصطلاحیں لائی گئی ہیں۔ "غزنوی" کی اصطلاح اقبال نے سلطان محمود غزنوی، فرمانروائے افغانستان، کے نام سے وضع کی ہے۔ جس سے کلام میں کل پانچ اشعار ہیں۔ مگر صرف "غزنوی" سے ہی ایک شعر ہے۔ باقی دو دو میں "غزنوی" کے ساتھ "ایاز" اور "ایازی" کی اصطلاحیں آئی ہیں۔ غزنوی نے سترہ بار ہندوستان پر حملہ کیا اور ان حملوں میں ایک بار ۱۰۲۶ء میں اس نے سمندر کے ساحل پر سومنات کا مندر لوٹا اور مندر کا بیشمار مالِ غنیمت جس میں ہیرے جواہرات شامل ہیں غزنی لے گیا۔ اُس وقت سومنات دراصل اس بُت کا نام تھا جو کاٹھیاوار کے ایک مشہور تیرتھ استھان سومناتھ پٹن کے مندر میں نصب تھا جو مندر کہ سمندر کے کنارے بنا ہوا تھا۔ حکومتِ ہند نے آزادی کے بعد اس مندر کی ازسرِنو تعمیر کرائی۔ "سومنات" کی اصطلاح سے کلام میں کل چار اشعار ہیں۔ اس سے اقبال نے ایک اصطلاح "سومناتی" بھی بنائی ہے جس سے ایک ہی شعر "ضربِ کلیم" کی نظم "ایک فلسفہ زدہ سیّد زادے کے نام" میں ہے۔

اس دوسرے بند کے اس دوسرے شعر میں اقبال تأسف کرتے ہیں کہ یہ دنیا کے صنم خانوں کے بُت مدّتوں سے اس بات کے منتظر ہیں کہ کوئی غزنوی دوبارہ پیدا ہو مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیائے اسلام میں اب کوئی بت شکن باقی نہیں رہا۔

تیسرے شعر میں اقبال اس افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ نہ تو ذکرِ عرب کے سوز میں عربی مشاہدات باقی ہیں اور نہ فکرِ عجم کے ساز میں عجمی تخیلات نظر آتے ہیں۔ یعنی نہ تو عربی ممالک کے مسلمانوں میں ذکر (محبّتِ رسولؐ) کا رنگ باقی ہے۔ نہ عجمی ممالک کے مسلمانوں میں فکر (علم) کا اندازہ نظر آتا ہے۔ مختصر یہ کہ ذکر اور فکر دونوں قوتوں کے اعتبار سے مسلمان مردہ ہو چکے ہیں۔ اقبال کے کلام میں "ذکر" اور "فکر" الفاظ سے مشتق دو اصطلاحیں ہیں جن سے بہت منفرد اشعار اور "ضربِ کلیم" میں ایک خصوصی نظم "ذکر و فکر" ہے۔ ان کا جواز اقبال نے سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیت ۱۹۱ سے فراہم کیا ہے جس میں ایک ساتھ "یَذْکُرُوْنَ" اور "یَتَفَکَّرُوْنَ" کے الفاظ آئے ہیں۔ دراصل "ذکر" اور "فکر" ایک سالک یا مومن کی روحانی ترقی کی منزلیں ہیں جس کی شان میں سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۱۳۱ میں

فرمایا گیا ہے کہ : وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ، (اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے) یعنی آدم کی فطرت میں جستجو اور تحقیق کا مادہ ہے۔ جس سے وہ زمان و مکان کی ماہیت دریافت کرتا ہے جو قوتِ فکر کا نتیجہ ہے اور قوتِ ذکر کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان سر بسجود ہو کر اپنے خالق کے سامنے اس کی پاکی بیان کرتا ہے۔ اس لیے یہ دونوں انسان کی دو بنیادی قوتوں کے نام ہیں۔ ذکر و فکر کا انسانی زندگی میں کیا مقام ہے اس پر اقبال "ضربِ کلیم" کی نظم "ذکر و فکر" میں کہتے ہیں۔

مقامِ فکر ہے پیمائشِ زماں و مکاں
مقامِ ذکر ہے سبحان ربیّ الاعلٰی

اقبال کے نظامِ فکر میں "ذکر" سے مراد ہے عشقِ الٰہی بتوسطِ رسولؐ جس کی بدولت قلب منوّر ہو جاتا ہے اور فکر سے مراد ہے چند مسلّمات کو اس طرح ترتیب دینا کہ ان کی مدد سے نئے معارف حاصل ہو سکیں۔ اس دوسرے بند کے اس دوسرے شعر میں اقبال یہی نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ مسلمانوں کی زبوں حالی کی وجہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں میں نہ تو اب روحانیت باقی ہے اور نہ ان میں تحقیق و جستجو کا مادہ ہے۔ ایسے مسلمان کو جو ان دونوں اوصاف سے متّصف ہو اقبال "مردِ خدا" کا نام دیتے ہوئے "بالِ جبریل" کی غزل ۲ (دوم) میں صوفیوں سے پوچھتے ہیں :۔

اے حلقۂ درویشاں وہ مردِ خدا کیسا !
ہو جس کے گریباں میں ہنگامۂ رستاخیز
جو ذکر کی گرمی سے شعلہ کی طرح روشن
جو فکر کی سُرعت میں بجلی سے زیادہ تیز

اس بند کے چوتھے شعر میں "قافلۂ حجاز" سے مُراد ملّت اسلامیہ ہے اور "حسین" سے مُراد ایک ایسا شخص ہے جو حق کی خاطر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جہاد میں کود پڑے۔ یہاں بھی اقبال کو افسوس ہے کہ کفر اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہے لیکن اس کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں میں کوئی شخص حضرت امام حسینؓ کے نقشِ قدم پر چلنے کو تیار نہیں۔ اس شعر میں

"دجلہ وفرات" دو جغرافیائی اصطلاحیں آئی ہیں۔ دونوں تین تین بار اقبال کے کلام میں لائی گئی ہیں۔ گرچہ اشعار پانچ ہیں۔ صرف "دجلہ" سے ایک ہی شعر "بانگ درا" کی نظم "ترانۂ ملّی" میں ہے۔ باقی چار اشعار میں یہ دونوں دیگر دریاؤں کے ساتھ آئی ہیں مگر ہر جگہ ان سے اسلامی ممالک ہی مراد ہیں کیونکہ اقبال نے ان ہی کو جغرافیائی اصطلاح بنایا ہے جو کبھی اسلام سے وابستہ تھیں یا اقبال کے عہد میں تھیں۔

پانچویں شعر میں اقبال نے عشق کے مضمرات اور اس کی ماہیت کو ذہن نشین کرایا ہے۔ اس لیے کہ اقبال کا سارا فکر صرف خودی، عشق اور فقر کے محور پر گردش کرتا ہے جو سب ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں۔ عشق سے پیدا شدہ سوز و گداز کی کیفیتوں پر اقبال نے فارسی مجموعۂ کلام "اسرار خودی" کے دیباچہ میں لکھا ہے:۔

> "انا کا استحکام عشق سے ہوتا ہے۔ یہ لفظ (اس موقع پر) بہت ہی وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنی ہیں جذب کر لینے اور اپنے آپ میں سمو لینے کی خواہش کے۔ اس کی سب سے اعلیٰ صورت قدروں اور نصب العین کی تخلیق اور ان کو ایک واقعیت بنا لینے کی کوشش ہے۔ عشق عاشق اور معشوق دونوں کو منفرد بنا دیتا ہے۔ "انا" کے استحکام کے لیے ہمیں عشق یعنی جذب کر لینے والی طاقت کو نشو و نما دینا چاہیئے نبی کریم علیہ الصّلوٰۃ کی سیرت میں جذب کرنے والے عمل کا سبق موجود ہے اور خصوصًا ایک مسلمان کے لیے۔"

عشق اقبال کے نزدیک ایک بنیادی جذبۂ حیات ہے۔ انسانی خودی حیات کی اعلیٰ سطحوں پر خودیٔ مطلق سے ملنے اور قرب الٰہی حاصل کرنے کے لیے بے چین رہتی ہے۔ اس کا یہ اضطراب، یہ تڑپ اور یہ بے چینی ہی جذبۂ عشق ہے۔ خودی کا سوز و ساز اور کیف و مستی ہی اسے پائدار بناتی ہے۔ عشق قلندر یا فقیر یا مردِ مومن اور انسانِ کامل کی تخلیقی فعلیت کا محرک ہے۔ قدر آفرین خودی عشق کے وسیلے سے، جو کچھ کرتی ہے اس کو زمانِ مسلسل مٹانے سے قاصر ہے۔ عشق کی ماہیت پر اقبال نے بسیط روشنی "بالِ جبریل" کی نظم "مسجد قرطبہ" کے دوسرے بند کے

ان اشعار میں اس طرح ڈالی ہے :۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ — عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رَو — عشق خود ایک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا — اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفےٰ — عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک — عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہہِ حرم، عشق امیرِ جنود — عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق ہے نورِ حیات، عشق ہے نارِ حیات

اس پانچویں شعر میں اقبال مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں کہ اگر دنیا میں سربلندی کی آرزو ہے تو عشق اختیار کرو، کیونکہ عقل، دل اور نگاہ ان تینوں قوتوں کی صحیح تربیت (اسلامی زاویۂ نگاہ سے) صرف عشق ہی کی بدولت ہو سکتی ہے۔ اگر ایک مسلمان کے اندر عشقِ رسولؐ کا جذبہ کارفرما نہ ہو تو پھر شریعت اور دین دونوں کی حقیقت بتکدۂ تصوّرات سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ عشقِ رسول ہی ہے جو کسی کو شریعت کے ارکانِ اسلام اور دین سے ضوابط، عقائدِ اسلام کی بجاآوری اور اس پر ایمانِ محکم رکھنے کی طرف راغب اور مائل کر سکتی ہے۔ عشق کے بغیر نہ تو مسلمان جہاد کر سکتا ہے اور نہ اس کے اندر یقین پیدا ہو سکتا ہے۔

اس شعر میں اقبال در پردہ یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ آج مسلمانوں کے زوال کا باعث یہی ہے کہ ہماری نظر میں شریعت اور دین تصوّرات سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے اور ایسا اس لیے ہے کہ چونکہ ان کے اندر عشقِ رسول کا جذبہ کارفرما نہیں ہے۔ نتیجتاً ہم نہ ارکانِ اسلام کے اقتضا پر عمل کرتے ہیں نہ عقائد کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔

اس بند کے چھٹے اور آخری شعر میں عشق کے نکتہ پر بلیغ صراحت کے بعد اقبال چند تاریخی شواہد اپنے دعوی کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ اسی عشق کی بدولت۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام نمرود جیسے ظالم بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہہ سکے اور حضرت حسینؓ کربلا کے میدان میں صبر واستقامت کا بے نظیر نمونہ دکھا سکے اور صحابۂ کرامؓ جنگ بدر اور جنگِ حنین میں اس شان کے ساتھ مقابلہ کر سکے۔

اس شعر میں شخصیتوں سے منسوب دو اصطلاحیں "خلیلؑ" اور حسینؑ" آئی ہیں پہلی اصطلاح اقبال نے سورۃ النساء ۴ کی آیت ۱۲۵ سے اخذ کی ہے جہاں ارشاد ہے کہ ہم نے حضرت ابراہیم کو اپنا دوست بنا لیا تھا کیونکہ عربی زبان میں خلیل کے معنی دوست کے ہیں "حسین" کی اصطلاح اردو زبان میں واقعۂ کربلا سے لائی گئی ہے۔ "خلیل" کی اصطلاح سے اقبال کے کلام میں گیارہ اشعار ہیں۔ گرچہ اس سے اقبال نے دو اصطلاحیں "خلیل اللہ" اور "خلیلاں" وضع کی ہیں جن سے ایک ایک ہی شعر ہے "حسینؓ" کی اصطلاح سے کلام میں کل تین اشعار ہیں۔ دو جغرافیائی اصطلاح "بدر" اور "حنین" میں "بدر" سے تین اور حنین سے بہی ایک شعر ہے۔ ان دونوں بیان سے یہاں مخصوص غزوے مراد نہیں بلکہ معرکہ وجود میں کامیابی مراد ہے۔ بدر کا نام لے کر قرآن میں جنگ کا ذکر نہیں مگر حنین کا ذکر سورۃ التوبہ ۹ کی آیات ۲۵ اور ۲۶ میں وارد ہے۔

تیسرا بند

آیۂ کائنات کا معنیٔ دیر یاب تو — نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو
جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مُردہ ذوق — خلوتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو
میں، کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ — میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو
بادِ صبا کی موج سے نشو و نمائے خار و خس — میرے نفس کی موج سے نشو و نمائے آرزو
خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش — ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو

فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بے قرار را
یک دو شکن زیادہ کُن گیسوئے تابدار را

عالم اسلام کی بیکسی اور بے چارگی پر نوحہ خوانی کے بعد اب اقبال اس بند میں براہِ راست اپنے محبوب رسول اللہؐ سے مخاطب ہوتے ہیں۔ اقبال سرکار دو عالمؐ کو بحوالہ

حدیثِ قدسی لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ باعثِ ایجادِ عالم، وجہ کائنات اور مرکز و محور جملہ موجودات یقین کرتے تھے۔ اقبال اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ سرکار دو عالمؐ کی غلامی اور دست پروری سے فیض یافتہ ہونا ہی ایمان کی اصل پہچان ہے۔ چنانچہ اس حدیث قدسی کو اقبال نے اپنے کلام میں مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو ذہن نشین کرایا۔

"لولاک" کی اصلاح سے اقبال کے کلام میں چار اشعار ہیں۔ پہلا شعر "بانگ درا" کی نظم "بلاد اسلامیہ" کے چوتھے بند میں ہے اور دوسرا اور تیسرا "بالِ جبریل" کی غزلیات ۱۰ اور ۴۶ میں اور چوتھا اسی مجموعہ کی ایک رباعی میں ہے۔ "بال جبریل" کی غزل ۱۰ کا شعر ہے ؎

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبال نے مسلمانوں کو عشق رسول کا درس دیتے ہوئے سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ کی تلمیح کی ہے۔

اقبال نے "لولاک" سے ایک اصطلاح "لولاکی" بھی وضع کی ہے جس سے صرف ایک ہی شعر "بال جبریل کی درج ذیل رباعی میں ہے جس میں اقبال نے مسلمانوں کو "شاہینِ شہِ لولاک کے لقب سے نوازا ہے:۔

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو — فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور — کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو

اس تیسرے بند کے پہلے شعر میں متذکرہ بالا حدیث قدسی کے حوالہ سے اقبال نے اس حقیقت کو ذہن نشین کرایا ہے کہ اگر کائنات کو ایک لفظ قرار دیا جائے تو حضورؐ کی ذات بابرکات اس لفظ کے معنی و مفہوم ہیں۔ یعنی اگر حضورؐ کا وجود مسعود نہ ہوتا تو یہ ساری کائنات بے معنی اور بے مقصد قرار دی جاتی۔ اس شعر میں "معنیٔ دیریاب" کی ترکیب لاکر اقبال نے یہ نکتہ ذہن نشین کرایا ہے کہ اس میں شک نہیں کہ آپ معنیٔ کائنات ہیں لیکن آپ کی حقیقت کا سمجھنا آسان نہیں ہے۔ چنانچہ "جاوید نامہ" میں کہتے ہیں ؎

عبدہٗ از فہم تو بالا تر است
زانکہ اُو ہم آدم و ہم جوہر است

خلاصہ کلام یہ کہ چونکہ کائنات کی ساری قدروقیمت آپؐ ہی کے دم سے ہے اس لیے ساری دنیا آپؐ کے نور سے فیضیاب ہونے کے لیے بیتاب و بےقرار ہے اور آپؐ کی تلاش میں ہر وقت سرگرداں رہتی ہے۔

اس بند کے دوسرے شعر میں "جلوتیانِ مدرسہ" سے مراد علماءِ دین اور "خلوتیانِ میکدہ" سے مراد صوفیوں کا طبقہ ہے۔ اقبال اس شعر میں تأسف کرتے ہیں کہ آجکل کے بیشتر علماء "کور نگاہ" اور "مردہ ذوق" ہیں اور صوفیوں کا حال یہ ہے کہ ان میں نہ تو روحانی ترقی کا جذبہ ہے اور نہ روحانیت کا رنگ ہے اور نتیجتاً ان دونوں گروہوں کے قلوب جذبۂ عشقِ رسولؐ سے خالی ہیں۔ "جلوتیانِ مدرسہ" کی "کور نگاہی" اور "مردہ ذوق" کو اقبال نے اپنے کلام میں منفرد اشعار کے علاوہ "ضربِ کلیم" کی نظم "مصلحینِ مشرق" اور نظم "مدرسہ" میں اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ "بالِ جبریل" کی غزل ۲۳ میں کہتے ہیں ؎

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

اسی طرح اقبال نے "خلوتیانِ میکدہ" کے "کم طلب و تہی کدو" ہونے کو "ضربِ کلیم" کی نظمیں "صوفی سے" اور "تصوف" میں اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے اور دونوں کو ایک ساتھ اسی مجموعہ کی درج ذیل نظم "مستیٔ کردار" اُن کے روحانی فقدان پر یوں ماتم کیا ہے:

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال   مُلّا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
شاعر کی نوا مُردہ و افسردہ و بے ذوق   افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھکو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

"جلوتیانِ مدرسہ" کی کور نگاہی اور مردہ ذوقی اور "خلوتیانِ میکدہ" کی کم طلبی اور

تہی کدو ہونے پر "بالِ جبریل" کی مثنوی "ساقی نامہ" کے دوسرے بند کے درج ذیل اشعار میں اقبال نے اس طرح اظہارِ تأسف کیا ہے :۔

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش — مگر دل ابھی تک ہے زنّار پوش
تمدّن، تصوّف، شریعت، کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ اُمّت روایات میں کھو گئی
لُبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب — مگر لذّتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا — لُغت کے بکھیڑوں میں اُلجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد — محبّت میں یکتا، حمیّت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا — یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

متذکرہ بالا نظم "مستیِ کردار" اور "ساقی نامہ" کے بند میں علی الترتیب "احوال" و "مقامات" کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ دونوں تصوّف کی اصطلاحیں ہیں۔ احوال سے مراد وہ کیفیتیں ہیں جو ایک سالک اپنی روحانی ترقی کے سلسلہ میں طے کرتا ہے اور "مقامات" سے مراد سلوک کی وہ خاص منزل ہے جس پر پہنچ کر سالک بلند تر منزل کے لیے مجاہدہ کرتا ہے ان دونوں کی اہمیت "بالِ جبریل" کی نظم "حال و مقام" میں اقبال اس طرح ذہن نشین کراتے ہیں ؎

احوال و مقامات پہ موقوف ہے سب کچھ
ہر لحظہ ہے سالک کا زماں اور مکاں اور

اس تیسرے بند کے اس دوسرے شعر میں اقبال یہ اظہارِ تأسف کرتے ہیں کہ نہ تو علماء میں عملِ صالح بجالانے کی مستی ہے اور نہ صوفیوں میں، گرچہ خود حضورؐ کی حیاتِ طیبہ مسلسل اور پیہم عملِ صالح کی مثال ہے۔ "بالِ جبریل" کی نظم "دعا" میں اقبال دعاگو ہیں ؎

چشمِ کرم ساقیا، دیر سے ہیں منتظر
جلوتیوں کے سبو، خلوتیوں کے کدو

اس بند کے تیسرے شعر میں اقبال رسولؐ کو اپنے کلام کی غرض وغایت گوش گزار کراتے ہیں ۔ وہ یہ کہ عاشقانِ رسولؐ کا ذکر لاکر وہ مسلمانوں کو "آتشِ رفتہ کا سراغ" بتاتے اور انھیں اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے کی ترغیب دیتے ہیں ۔ اپنے کلام کی اس مقصدیت پر "بالِ جبریل" کی غزلیات ۹ (اوّل) اور ۴۸ میں علی الترتیب مسلمانوں کو باور کراتے ہیں کہ:

مرا سبو چہ غنیمت ہے اس زمانے میں — کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو
مرے کدو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب — نہ مدرسے میں ہے باقی، نہ خانقاہ میں ہے

اس بند کے چوتھے شعر میں اقبال نے رسول اللہؐ کو گوش گزار کرایا ہے کہ ان کی شاعری کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں "آرزو" نشوونما پا سکے ۔ اقبال کے کلام میں "آرزو" الفاظ سے مشتق ایک اصطلاح ہے جس سے وہ دینِ اسلام کو سربلند کرنے، دنیا کو قرآنی تعلیمات سے آگاہ کرنے، دنیا سے باطل کو مٹانے، دنیا کو سرکارِ دو عالم کا حلقہ بگوش کرنے، دنیا میں حکومتِ الٰہیہ کا قیام کرنے اور دنیا کو باعثِ رحمت بنانے کی آرزوئیں مراد لیتے ہیں ۔ اس اصطلاح سے انہی معنوں میں بہت اشعار ہیں جن میں چند یہ ہیں جو نفسِ مضمون کی خاطر نقل کیے جارہے ہیں اور جو علی الترتیب "بانگِ درا" کی نظم "خضرِ راہ" کی ذیلی نظم "دنیائے اسلام"، "بالِ جبریل" کی غزل ۶ (دوم) اور "ارمغانِ حجاز" کی نظم "ملّازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض" کے چوتھے بند کے ہیں:

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار — ہر زماں پیشِ نظر لایخلف المیعاد دار
طبیبِ عشق نے دیکھا مجھے تو فرمایا — ترا مرض ہے فقط آرزو کی بے نیشی
پاک ہوتا ہے ظن و تخمیں سے انساں کا ضمیر — کرتا ہے ہر راہ کو روشن چراغِ آرزو

اقبال کے کلام میں "آرزو" کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ "ارمغانِ حجاز" کی نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں اقبال کی صدارتی تقریر میں اس کی زبان پر یہ

شعر رکھتے ہیں:۔

ہے اگر مجھ کو خطر تو اس اُمّت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

اس بند کے پانچویں شعر میں اقبال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو یہ بھی گوش گزار کراتے ہیں کہ میری شاعری اوہامِ باطلہ یا خیالاتِ رکیکہ کا نتیجہ نہیں بلکہ خونِ دل و جگر کا مجموعہ ہے۔ یعنی اس محبّت کا نتیجہ ہے جو مجھے آپؐ کی ذاتِ بابرکات سے ہے اور اس لیے محبّتِ رسولؐ کا رنگ میرے ہر شعر میں ہے۔ اس شعر میں "نوا" اور "خونِ دل و جگر" کے الفاظ سے مشتق اصطلاحیں بھی آئی ہیں۔ "نوا" سے مراد پیغام اور خونِ دل و جگر سے مراد نصب العین سے عشق ہے۔ "نوا" سے بمعنی پیغام چند اشعار اقبال کے کلام میں یہ ہیں جن میں "خونِ دل و جگر" کی ترکیب بھی آئی ہے۔ یہ اشعار بالِ جبریل کی غزلیات ۱ (اوّل) ۱۳ (دوم)، ۲۳ اور نظم "دعا" علی الترتیب ہیں۔

فقیرِ راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی — بہا میری نوا کی دولتِ پرویز سے ساقی
ہوائے قرطبہ شاید یہ ہے اثر تیرا — میری نوا میں ہے سوز و سرورِ عہدِ شباب
نوائے صبح گاہی نے جگر خوں کر دیا میرا — خدایا جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے
ہے یہی میری نماز، ہے یہی میرا وضو — میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو

اس بند کے چھٹے اور آخری شعر میں اقبال نے اپنی فارسی تصنیف "زبورِ عجم" کا برمحل شعر نقل کر کے حضورؐ کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے:۔

چوتھا بند

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب — گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ — ذرّۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم، تیرے جلال کی نمود — فقرِ جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب
شوقِ ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام — میرا قیام بھی حجاب! میرا سجود بھی حجاب

تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے　　　عقل، غیاب و جستجو! عشق حضور و اضطراب

تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے
طبعِ زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے

اب تک کے بندوں میں اقبال نے اپنی اور اپنی قوم کی حالت بیان کی۔ اب اس بند میں وہ حضورؐ کی شان بیان کرتے ہیں۔ اقبال نے ایک حمد نہیں لکھی مگر "بال جبریل" کی شروع کی سولہ غزلوں کو حمد بنا دیا۔ اقبال نے ایک نعت نہیں لکھی مگر اپنے سارے کلام کو نعتیہ بنا دیا اور اگر ان کے کلام میں ادب کے صنفی اعتبار سے نعت کہی جا سکتی ہے تو اس نظم "ذوق و شوق" کے اس چوتھے بند کو۔ الفاظ ہیں کہ نگینہ کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔

اس بند کے پہلے شعر میں اقبال حضورؐ کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپؐ ہی کے وجودِ مسعود کی بدولت عالم وجود میں آیا۔ اگر آپؐ نہ ہوتے تو نہ لوح ہوتی اور نہ قلم ہوتا اور نہ کتاب (قرآن) ہوتی۔ آپؐ کی شان کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آسمان کے طول و عرض کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ آپؐ کے محیط وجود کے سامنے اس کی حقیقت ایسی ہے جیسے ایک سمندر کے سامنے بلبلا۔ اس شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبال نے رسول اللہؐ کی شان یہ بتائی ہے کہ "تیرا وجود الکتاب"، یہ کہہ کر اقبال نے سورۃ المائدہ ۵ کی آیت ۴۸ کے درج ذیل پہلے فقرے کی تلمیح کی ہے:۔

"پھر اے نبیؐ! ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ و نگہبان ہے"۔

اقبال اس سے قبل "بال جبریلؒ کی غزل ۱ (دوم) میں ایسا ہی نذرانۂ عقیدت رسول صلعم کے حضور پیش کر چکے تھے۔

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسین، وہی طٰہٰ

دوسرے شعر میں اقبال یہ نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں کہ کائنات کو آپؐ ہی کے ظہور سے فروغ حاصل ہوا اور آپؐ ہی کے قدموں کی برکت سے "ذرّہ ریگ" یعنی ادنیٰ آدمی آفتاب بن کر چمکا۔ ایسا ہی نذرانہ اقبال نے متذکرہ بالا غزل میں یہ کہہ کر پیش کیا ہے ؎

وہ دانائے سُبل ختم الرّسل مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا

اس بند کے تیسرے شعر میں یہ نذرانہ پیش کرتے ہیں کہ سلطان سنجر اور سلطان سلیم آپؐ کی شانِ جلال اور حضرت جنیدؒ اور حضرت بایزید بسطامیؒ آپ کی شانِ جمال کے مظہر ہیں اس شعر میں چاروں نام اقبال کے کلام میں شخصیتوں سے منسوب اصطلاحیں ہیں۔

سلطان سنجر بن ملک شاہ ۵۱۱ھ میں سلجوقی سلطنت کا بادشاہ بنا اور اس کا انتقال ۵۵۲ میں ہوا۔ یہ دولتِ سلجوقیہ کے بانی سلجوق بن دقاق کے خاندان سے تعلّق رکھتا تھا۔ سلجوقیوں میں سب سے زیادہ عظمت سنجر کو حاصل ہوئی۔ اس کی حکومت خراسان، خوارزم، آرمینیا، آذربائیجان، موصل، دیار ربیعہ، دیار بکر، حرمین اور ماوراءالنّہر تک پھیلی ہوئی تھی۔ "سنجر" کی اصطلاح سے کلام میں کل پانچ اشعار ہیں جن میں چار "بالِ جبریل" کی غزلیات ۴۸ اور ۵۴ اور ایک ایک اس نظم "ذوق و شوق" اور ایک رباعی میں ہیں اور پانچواں "ضربِ کلیم" کی نظم "خودی کی زندگی" میں ہے۔

سلیم خاں سلاطینِ عثمانیہ ترکیہ کا ایک سلطان گزرا ہے۔ اس سلطنت کے بانی عثمان خاں نے ۶۹۹ھ میں پُرانی سلجوقی حکومت کی بنیادوں پر سلطنت عثمانیہ ترکیہ کی نئی عمارت قائم کی تھی۔ سلیم خاں جسے تاریخ میں سلیم خاں (اوّل) کہا جاتا ہے، ۹۱۸ھ مطابق ۱۵۱۱ء میں سلطنت پر تخت نشین ہوا۔ اس کا انتقال ۹۲۶ھ میں ہوا۔ ۹۲۰ھ میں اس نے ایران کا ایک بڑا حصّہ آرمینیا، جارجیا، کوہ قاف اور کاشغر پر قبضہ کرکے اپنی سلطنت میں ملا لیا۔ آذربائیجان، کردستان، عراق اور ساحل خلیج فارس بھی اس کی سلطنت کے حدود میں آ گئے۔ "سلیم" کی اصطلاح سے صرف یہی ایک شعر ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ اگرچہ ایرانی النسل تھے مگر ان کے والدین نے تیسری صدی ہجری کے شروع میں ہی بغداد میں سکونت اختیار کرلی تھی جہاں آپ کی پیدائش ہوئی۔ آپ کی وفات ۲۹۸ھ میں ہوئی۔ آپ صوفیاء کے طبقۂ ثانیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور "سیدالطائفہ" کے لقب سے نوازے جاتے ہیں۔ اقبال کے کلام میں "جنید" کی اصطلاح سے صرف تین اشعار ہیں۔ ایک اس بند میں، دوسرا "بالِ جبریل" کی غزل ۵۴ میں اور تیسرا ارمغانِ حجاز" کی نظم "ملّا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض" کے چودھویں بند میں۔ اقبال نے "جنید" سے ایک اصطلاح "جنیدی" بھی وضع کی ہے جس سے کلام میں ایک ہی شعر "بال جبریل" کی نظم "دین وسیاست" میں ہے۔ حضرت جنیدؒ کی تصانیف میں "محاسبہ" پر بہت زور ملتا ہے۔ آپؒ کی مشہور تصانیف "رعایتاً لحقوق اللہ" کتاب الوصایا" اور "فصل فی المحبّت" ہیں۔

حضرت بایزید بسطامیؒ صوفیاء میں طبقۂ اولیٰ سے تعلق رکھتے تھے۔ دوسری صدی ہجری کے آخر میں پیدا ہوئے اور ۲۳۱ھ میں وفات پائی۔ طبقہ صوفیاء میں اتباعِ شریعت کے لیے مشہور ہیں۔ ان کا یہ مقولہ بہت مشہور ہے:-

الاستقامۃ فوق الکرامۃ (شریعت اسلامیہ پر استقامت رکھنا کرامت دکھانے سے بڑھ کر ہے)

"بایزید" سے اقبال کے کلام میں دو ہی اشعار ہیں۔ ایک تو اس بند کا یہ شعر ہے اور دوسرا "بالِ جبریل" کی غزل ۵۴ کا درج ذیل شعر ہے جس میں تین نام آئے ہیں جو اس بند کے اس شعر میں ہے ؎

عجب نہیں کہ مسلماں کو پھر عطا کر دیں
شکوہِ سنجر و فقرِ جنیدؒ و بسطامیؒ

اس بند کے چوتھے شعر میں اقبال عرض پرداز ہیں کہ اگر آپؐ کی محبّت یعنی آپؐ کی اتباع کا جذبہ ارکانِ شریعت کی بجاآوری کا محرک نہ ہو تو کوئی عبادت اللہ کی بارگاہ میں مقبول

نہیں ہوسکتی۔ اس شعر میں کلیدی لفظ "شوق" ہے جو اقبال کے کلام میں الفاظ سے مشتق ایک اصطلاح ہے جس سے بہت سارے منفرد اشعار اور نظمیں ہیں۔ اس اصطلاح پر اس مضمون کے شروع میں "تمہید" کے تحت روشنی ڈالی جاچکی ہے۔ "شوق" کی اصطلاح سے "بال جبریل" کی غزل ۲۸ کا یہ شعر پیش ہے جس میں اقبال اپنے متعلق کہتے ہیں ؎

مقامِ عقل سے آساں گذر گیا اقبالؔ
مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

اس بند کے پانچویں شعر میں اقبال رسول اللہ کے حضور یہ عرض کرتے ہیں کہ یہ آپؐ ہی کا فیض ہے کہ عقل اور عشق دونوں مراد پاگئے۔ عقل غیاب و جستجو کی طالب تھی، یہ دولت اسے مل گئی۔ اور عشق حضور و اضطراب کا آرزو مند تھا، یہ نعمت اسے عطا ہوگئی۔

اس شعر میں عقل کو "غیاب و جستجو" اور عشق کو "حضور و اضطراب" کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ واضح ہو کہ ذاتِ عقل کا یہ تقاضا ہے کہ اس میں "غیاب و جستجو" یعنی مقصد سے دور رہنے اور تلاش کرنے کا رنگ پایا جائے۔ اور ذاتِ عشق اس کی مقتضی ہے کہ اس میں "حضور و اضطراب" کی کیفیت پائی جائے۔ آپؐ ہی کی بدولت ہر شے کو اس کی صورتِ نوعیہ نصیب ہوئی۔ عقل "غیاب" یعنی دور رہنے کی حالت سے مطمئن ہوسکتی ہے لیکن عشق حضوری کا طالب ہے یعنی وہ تو محبوب کو بے پردہ دیکھنا چاہتا ہے۔

"غیاب" و "حضور" اقبال کے کلام میں الفاظ سے مشتق دو اصطلاحیں ہیں جن سے بہت سے اشعار ہیں۔ متذکرہ بالا معنوں میں ہی ان اصطلاحوں سے چند اشعار ذیل میں نقل کیے جارہے ہیں جو ان اصطلاحوں پر مزید روشنی ڈالتے ہیں۔ پہلا تین شعر "بالِ جبریل" کی غزلیات ۱۵ (دوم)، ۲۸ اور ۶۰ کا ہے اور باقی دو "ضربِ کلیم" کی نظم "موت" اور "اہلِ ہنر سے" کے ہیں:۔

اک اضطرابِ مسلسل غیاب ہو کہ حضور — میں خود کہوں تو مری داستاں دراز نہیں
کوئی بتائے مجھے یہ غیاب ہے کہ حضور — سب آشنا ہیں یہاں ایک میں ہوں بیگانہ

تڑپ رہا ہے فلاطوں میانِ غیب و حضور　　ازل سے اہلِ خرد کا مقام ہے اعراف
لحد میں بھی غیب و حضور رہتا ہے　　اگر ہو زندہ تو دلِ ناصبور رہتا ہے
تیری خودی کا غیاب معرکۂ ذکر و فکر　　تیری خودی کا حضور عالمِ شعر و سرود

تیسرے شعر میں اقبال نے سورۃ الاعراف، کی آیات ۴۶ تا ۵۱ کی تلمیح کی ہے۔

"حضور" کی اصطلاح سے دو درج ذیل اشعار اور ہیں جو علی الترتیب "بالِ جبریل" کی غزل ۲۰ اور نظم "دعا" کے ہیں:۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں　　اس کی تقدیر میں حضور نہیں
صحبتِ اہلِ صفا، نور و حضور و سرور　　سرخوش و پرسوز ہے لالہ لب آبجو

اقبال نے "حضور" سے ایک اصطلاح "بے حضوری" بھی اس کے تضاد میں وضع کی ہے جس سے درج ذیل دو اشعار میں علی الترتیب "بالِ جبریل" کی غزل ۲۰ اور "ضربِ کلیم" کی نظم "ایک فلسفہ زدہ سیّد زادے کے نام" میں ہیں:۔

بے حضوری ہے تیری موت کا راز　　زندہ ہو تو بے حضور نہیں
انجامِ خرد ہے بے حضوری　　ہے فلسفہ زندگی سے دوری

اس بند کے چھٹے اور آخری شعر میں اقبال عرض پرداز ہیں کہ اے میرے آقا! جلوۂ آفتاب سے مادی اشیاء منور ہو سکتی ہیں لیکن انسانی قلوب منوّر نہیں ہو سکتے۔ چونکہ دنیا مادہ پرستی کی وجہ سے روحانیت سے محروم ہوگئی ہے اس لیے میری آپؐ سے التجا ہے کہ آپ اپنے روحانی فیض سے اس دور میں دنیا کو منوّر کر دیجیے۔

پانچواں بند

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ شب و روز　　مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم نخیل بے رطب
تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا!　　عشق تمام مصطفےٰ! عقل تمام بولہب
گاہ بحیلہ می برد، گاہ بزور می کشد　　عشق کی ابتدا عجب! عشق کی انتہا عجب
عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق　　وصل میں مرگِ آرزو! ہجر میں لذتِ طلب

عین وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا　　گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہِ بے ادب

گرمیٔ آرزو فراق! شورشِ ہائے و ہو فراق

موج کی جستجو فراق! قطرہ کی آبرو فراق

اس بند کے پہلے شعر میں اقبال رسول اللہ سے عرض کرتے ہیں کہ اے میرے آقا! آپ تو میری سابقہ زندگی سے بخوبی واقف ہیں۔ اگر میں اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں مسلکِ عشق پر گامزن نہ تھا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں علم کو حصولِ مقصدِ حیات کے لیے کافی سمجھتا تھا۔ مگر اب مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ عشقِ رسول کے بغیر کوئی شخص خدا تک نہیں پہنچ سکتا کیونکہ علم "نخیلِ بے رطب" ہے جس میں پھل نہیں لگتا۔

اس شعر میں اقبال نے دو باتیں ذہن نشیں کرائی ہیں۔ ایک عشقِ الٰہی بتوسطِ عشقِ رسول اور دوسری علم اور عشق کا فرق۔ اوّل الذکر پر اقبال سورۃ آلِ عمران ۳ کی درج ذیل آیات ۳۱ اور ۳۲ کو ایمان کی کسوٹی قرار دیتے ہوئے ذہن نشیں کراتے ہیں:۔

"اے نبیؐ، لوگوں سے کہدو کہ: اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبّت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔" ان سے کہو کہ: "اللہ اور رسول کی اطاعت قبول کرو۔" پھر اگر وہ تمہاری یہ دعوت قبول نہ کریں تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبّت کرے، جو اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں۔"

اقبال نے انھی آیات کی منظوم ترجمانی "بانگِ درا" کی نظم "جوابِ شکوہ" کے آخری بند کے درج ذیل آخری شعر میں کی ہے ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

دوسری بات علم اور عشق کا فرق ہے۔ اقبال کے یہاں فقر اور عشق ایک ہی سکّے کے

دو رخ ہیں اور ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔ چنانچہ اس فرق پر "بال جبریل" کی غزل ۵۹ کے درج ذیل اشعار میں کہتے ہیں:۔

علم و فقیہہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم — علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ
فقر مقامِ نظر، علم مقامِ خبر — فقر میں مستیِ ثواب، علم میں مستی گناہ

علم کا "موجود"، اور، فقر کا "موجود"، اور
اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہ، اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہ

پھر علم اور عشق پر "ضرب کلیم" کی نظم "علم و عشق" کے پہلے دو بندوں میں کہتے ہیں:۔

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن، کرم کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب

پہلے شعر کی وضاحت کرتے ہوئے اس بند کے دوسرے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ کچھ عرصہ تک عقل کی پیروی کرنے کے بعد مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ میں اتباعِ عقل کی بدولت انسانِ کامل کے مرتبہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ آپ کی غلامی اختیار کی جائے۔ عشق تمام مصطفٰے ہے کیونکہ عشق رسولؐ کی بدولت انسان کے اندر صفات رسول کا رنگ پیدا ہو سکتا ہے اور چونکہ عقل گمراہ کن ہے اس لیے تمام بولہب ہے۔ اس حقیقت کو اقبال نے "ارمغانِ حجاز" کی نظم "حسین احمد" میں یوں بیان کیا ہے۔

بمصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

اقبال کے کلام میں "مصطفیٰ" اور "بولہب" دونوں شخصیتوں سے منسوب اصطلاحیں ہیں۔ مصطفیٰ کی اصطلاح سے کل چھ اشعار ہیں جن میں ایک تو اسی بند کے زیرِ تجزیہ شعر میں ہے اور ایک اوپر "ارمغانِ حجاز" میں ہے۔ باقی چار میں دو "بانگ درا" کی نظم "بلادِ اسلامیہ" کے آخری بند اور نظم "خضرِ راہ" کی ذیلی نظم "شاعر" کے آخری بند میں ہیں۔ اور دو "بالِ جبریل" کی غزل ۳ (دوم) اور نظم "مسجدِ قرطبہ" کے دوسرے بند میں۔ اقبال نے "مصطفیٰ" سے ایک اصطلاح "مصطفائی" بھی وضع کی ہے جس سے ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی ایک رباعی میں ہے۔ ایک اور اصطلاح "مصطفویؐ" بھی وضع کی ہے جس سے چار اشعار ہیں۔ جن میں دو اشعار "بانگِ درا" کی نظم "وطنیت" میں اور ایک اسی مجموعہ کی نظم "ارتقا" میں اور ایک ضربِ کلیم کی نظم "اُمرائے عرب سے" میں ہے۔

"بولہب" کی اصطلاح سے ایک ہی شعر ہے جو اس بند میں ہے۔ اس سے اقبال نے دو اصطلاحیں "بولہبی" اور "ابولہبی" وضع کی ہے۔ بولہبی" سے ایک شعر "ارمغانِ حجاز" کا اوپر گزر چکا ہے۔ باقی دو میں ایک "بانگ درا" کی نظم "ارتقاء" اور ایک "ضربِ کلیم" کی نظم "امرائے عرب سے" میں "مصطفوی" کے ساتھ آئی ہیں۔ "ابولہبی" کی اصطلاح سے ایک ہی شعر "بانگ درا" کی غزلیات حصّہ سوئم کی چوتھی غزل میں ہے۔

تیسرے شعر میں "حیلہ" سے مراد "سلوک" ہے اور زور سے مراد "جذب" ہے۔ جذب اور "سلوک" تصوف کی اصطلاحیں ہیں۔ چنانچہ اقبال نے ان دونوں کو اس شعر میں استعمال کیا ہے ؎

قلبِ او را قوت از جذب و سلوک
پیشِ سلطاں نعرہ او "لا ملوک"

اقبال کے کلام میں "جذب" الفاظ سے مشتق ایک اصطلاح ہے جس سے ان کی مراد شریعت کا باطنی پہلو ہے یعنی مقامِ عشق و محبّت اور یہ وہ درجہ ہے کہ جب مسلمان اسے حاصل کر لیتا ہے تو فلک الافلاک یعنی ساری کائنات کے اسرار و حقائق اس پر

کھل جاتے ہیں۔ اس نکتہ پر "بالِ جبریل" کی غزل ۸۰ میں یہ اشعار ہیں:

اک شرعِ مسلمانی، اک جذبِ مسلمانی ہے جذبِ مسلمانی سِرّ فلک الأفلاک
اے رہرو فرزانہ! بے جذبِ مسلمانی نے راہِ عمل پیدا، نے شاخِ یقیں نمناک

اس بند کے اس تیسرے شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبال کہتے ہیں کہ عشق کی ابتدا اور انتہا دونوں فہم سے بالاتر ہیں۔ ابتدا تو یوں وراء العقل ہے کہ بعض آدمیوں کو خدا تک پہنچنے میں برسوں لگ جاتے ہیں اور انتہا اس لیے وراء الفہم ہے کہ جب بندہ واصل ہوجاتا ہے تو اس میں فوق العادہ خواص پیدا ہوجاتے ہیں یعنی وہ زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہوجاتا ہے۔

اس بند کے چوتھے اور پانچویں اشعار میں اقبال یہ نکتہ واضح کرتے ہیں کہ فراق کو وصل پر فضیلت حاصل ہے۔ عاشق کی دنیا میں فراق وصل سے بڑھ کر ہے کیونکہ وصل تو مرگِ آرزو کا نام ہے اور جب آرزو باقی نہ رہے تو عشق کی لذّت ختم ہوجاتی ہے۔ اس حقیقت کو اقبال نے "پیامِ مشرق" کے اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

تو نشناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیاتِ دوام؟ سوختن ناتمام

اقبال کہتے ہیں کہ اگرچہ میری نگاہ دیدار کی مشتاق تھی لیکن میں نے وصل کی حالت میں بھی، محبوب کی طرف نہیں دیکھا تاکہ "لذّتِ طلب" برقرار رہے۔

اس بند کے آخری اور چھٹے شعر میں اقبال اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ عشق کا سارا نظام فراق ہی پر مبنی ہے۔ اگر وصال ہوجائے تو عشق ختم ہوجائے گا جس طرح موج یا قطرہ اگر دریا سے واصل ہوجائے تو دونوں کی ہستی فنا ہوجائے گی۔ بس ثابت ہوا کہ عاشق کی ہستی فراق ہی پر منحصر ہے۔

نظم "ذوق و شوق" کا مطالعہ تو اختتام پذیر ہوا مگر اس مضمون کو "بالِ جبریل" کی غزل ۱۴ (دوم) کے درج ذیل شعر پر ختم کرنا مناسب ہوگا کیونکہ اس شعر میں اقبال

نے حضور صلّے اللہ علیہ وسلّم کو مسلمان قوم کے زوال اور انحطاط کی دو وجہیں بتائی ہیں. ایک یہ کہ ان کی دانش افرنگی ہو چکی ہے۔ تہذیب مغرب نے ان کے معیار حسن و قبح کو بدل دیا ہے اور دوسرے یہ کہ اگرچہ مسلمان زبان سے تو اسلام کا اقرار کرتے ہیں مگر ان کے اعمال سراسر غیر اسلامی ہو چکے ہیں۔ دریں حالات قوم تنزلی کے اس درجہ کو پہنچ چکی ہے کہ اب اصلاح ممکن نہیں۔ اس لیے اقبال بے اختیار سرکار دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے التجا کرتے ہیں کہ ؎

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
مرا دانش ہے افرنگی، مرا ایماں ہے زنّاری

محمد عبداللہ مغیثی
اجراڑہ، میرٹھ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی کے

خطبات، مقالات اور ان کا ادب

اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں بیشمار ایسی عظیم شخصیتیں گزریں جنھوں نے اپنی زبان وقلم سے تاریخی خدمات انجام دیں، مرورِ زمانہ سے فسق وفجور کا جب بھی زور ہوا اور مسلم معاشرہ رسم ورواج وجہالت کی زد میں آیا تو حق تعالیٰ نے کسی نیک رہبر، مقتدا، قائد کو پیدا فرمادیا جو اپنی زبان کی تاثیر اور اپنے قلم کی طاقت سے بگڑے ہوئے مسلم معاشرہ کو پاک وصاف کرنے کی جدوجہد کرتا ہے اور ایک پاکیزہ معاشرہ وجود میں آجاتا ہے، یہ مجددین، مصلحین، ہر صدی میں پیدا ہوتے رہے ہیں اور اپنے اخلاق واعمال سے اُمّت کی اصلاح فرماتے رہے ہیں۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، مجدد الف ثانیؒ، حضرت مولانا شاہ ولی اللہؒ، حضرت مولانا سید احمد شہیدؒ، حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا محمد الیاسؒ، سر سید احمد خاںؒ، مولانا شبلی نعمانیؒ، حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ، حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ جیسی عظیم شخصیتوں نے اپنے اپنے دور میں اپنی زبان وقلم کو اسلام کے بقاء وتحفظ اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لیے بھرپور استعمال کیا۔ کسی بھی مصلح کی زبان وقلم حدودِ اسلامی سے تجاوز نہیں کرتی وہ ادبِ اسلامی کو قرآن وسنّت کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔ چونکہ ادبِ اسلامی مشکوٰۃِ وحی اور اسوۂ نبوی سے ہی اکتساب فیض کرتا ہے۔ اسلامی ادباء

اسلام اور اس کے اقدار کے پابند ہیں۔ ادب اسلامی نے ہمیشہ اُمّت اسلامیہ کی قیادت کا فریضہ انجام دیا۔ اسلامی مفکّر، مصلح، ادیب اُمّت کی فکر اور اس کے جذبات کا امین ہوتا ہے اس بارگراں کو یہ حضرات اس لیے اٹھاتے ہیں کہ ان کا تصوّر صحیح اور ان کی معلومات بھرپور ہوتی ہیں۔

ادب اسلامی تمام باطل نظریات کو مسترد کر دیتا ہے اور ایسا پاکیزہ ماحول، معاشرہ لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے جو فطرت کے مطابق اور اسلامی اعلیٰ اقدار کا محافظ ہو۔ ادب اسلامی کی بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ مخاطب کو بہت جلد متأثر کر دیتا ہے اس لیے اسلامی ادیب اپنی زبان اپنے قلم میں ایسی لچک ایسے پُرکشش الفاظ استعمال کرتا ہے جو سہل، پُرکشش اور نتیجہ خیز بھی ہو۔ ادب کی صحیح تشریح خود مولانا نے کاروانِ ادب کے شمارہ نمبر۲ کے پیغام (پیغام اور رابطہ ادب) میں اس طرح فرمائی ہے۔

ادب ادب ہے خواہ وہ کسی مذہبی انسان کی زبان سے نکلے، یا کسی پیغمبر کی زبان سے ادا ہو یا کسی آسمانی صحیفہ میں ہو اس کی شرط یہ ہے کہ بات اچھّی طرح کہہ دی جائے، سننے والا اس سے لطف اٹھائے اس کو قبول کرلے۔ مولانا فرماتے ہیں:۔

ادب تھا کہاں؟ لیکن جب خدا نے انسانوں کو سمجھانے کے لیے اپنے پیغمبروں کو بھیجا اور ان کو زبان دی ان پر معانی کے ساتھ الفاظ وارد کئے تو معلوم ہوا کہ ادب اسے کہتے ہیں پھر قرآن مجید نے آکر اس پر مزید مہر لگادی نزل به الروح الأمين على قلبك لتكون من المنذرين ٥ بلسانٍ عربيٍّ مبين ٥ ادب کا پایہ کتنا بلند کیا خدا تعالیٰ اپنی کتاب کی تعریف ادب کے ساتھ کر رہا ہے، یعنی یہ کہ وہ معجزہ لسان عربی مبین میں ہے۔

جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے تو یہاں کی تحریکات وادبی زندگی میں یہاں کے لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور بنیادی حصّہ لیا چنانچہ سب کہتے ہیں کہ قصر ادب کے چار ستون ہیں مولانا محمد حسین آزاد دہلویؒ، خواجہ الطاف حسین حالیؒ، ڈپٹی نذیر احمدؒ، مولانا شبلیؒ آپ دیکھئے کہ چاروں اسی تعلیم کے پروردہ تھے، مدرسوں کے پڑھے ہوئے اور علماء کے شاگرد تھے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ کوئی اس وقت تک حقیقی اور فطری ادیب بن ہی نہیں سکتا جب تک اس کے اندر مذہبی حقائق

پر کچھ ایمان اور دل کے اندر درد نہ ہو۔ کیا بات ہے؟ مولانا جلال الدین رومیؒ، شیخ سعدیؒ، مولانا حالی، اور ہندوستان میں میر درد، مرزا غالبؔ مرزا مظہر جان جاناں، علامہ اقبالؔ، اور جگرؔ کے پایہ کا کوئی نظر نہیں آتا۔

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ مکمل ادیب وہ ہے جس کے عقائد میں پختگی، اعمال میں درستگی، اور قلب و دماغ میں روح اسلامی کا جذبہ کارفرما نہ ہو تو وہ مصلح ادیب نہیں بن سکتا، حضرت مولانا کا ادب ان صفات سے مزین ہے۔ مولانا کے ادب کا مأخذ قرآن مجید، اتباع سنت نبوی، محبت صحابہ، احترام علماء اکابر، فکر امت اور جدید و قدیم ادباء سے لگاؤ ــــ اسی فطری اور قلبی لگاؤ نے مولانا کو اس دور کا بہترین اسلامی ادیب بنا دیا۔ اسی ادب کی چاشنی مولانا کے بیانات، پیغامات، خطبات، مقالات کی جان اور روح ہے۔ جو ہر طبقہ کو جھنجھوڑتی ہے اور سامعین متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس کے اثرات ہند و بیرون ہند میں آج مقبول خواص و عوام ہیں۔

جس شخصیت نے جزیرۃ العرب، امریکہ، برطانیہ، افریقہ، ہند و پاک کے اجتماعات کانفرنسوں سیمیناروں اور تحریکی اجلاسوں میں پوری انسانیت کو پیغام انسانیت دیا۔ اس مقالہ میں میرا موضوع ایک ایسی عظیم شخصیت ہے جس نے بیک وقت عربی، اردو ادب اسلامی کے ذریعہ اس صدی میں ملت اسلامیہ کی بھرپور قیادت کا فریضہ انجام دیا ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے خطبات مقالات اور ان کا ادب

حضرت مولانا مدظلہٗ کی پیدائش ایک ایسے عظیم خاندان میں ہوئی جس کی گھٹی میں فکر امت، واصلاح امت کوٹ کوٹ کر ڈالی گئی تھی دراصل اصلاح امت کا فکر پیدائشی ہوتا ہے ان کی پرورش خاندان کے مخلص، دیندار، متبع سنت افراد کی گود میں ہوئی۔

اس خاندان کا ہمیشہ سے اپنی اولاد کی پرورش میں ایک خاص وصف کارفرما رہا ہے (وہ ہے) کہ شخصیات کے خلاف جذبۂ نفرت کے بجائے ان سے علمی، عملی، استفادہ اور ان کے کردار کو اپنے لیے مشعل راہ بنانا کسی بھی شخصیت یا مکتبہ فکر سے تعصب کسی بھی ہونہار شخصیت میں بڑی رکاوٹ

ہے۔ زمانہ طالب علمی سے ہی آپ نے اپنے بھائی کی سرپرستی میں مختلف چیزیں پڑھیں۔ قدیم وجدید سے استفادہ کیا۔ بھائی چونکہ وسیع النظر، اور جوہر شناس تھے اس لیے مولانا کو ندوہ کے اساتذہ کے علاوہ دیگر اداروں کے اساتذہ کے یہاں استفادہ کرنے میں بڑی آسانی ہوئی۔ حضرت مولانا نے اپنے دور کی اہم شخصیتوں اور مکتبۂ فکر میں اپنی علمی تشنگی بجھائی اور عملی راہیں بھی متعین کیں۔ اور سب کی قدر و منزلت بھی مولانا کے قلب میں گھر کر گئی۔ لیکن حضرت مولانا میں بچپن ہی سے ذہن کی پختگی تھی اس لیے استفادہ سب سے کیا۔ احترام ادب آج تک جاری ہے لیکن خاندانی تربیت اور صحیح تعلیم و تربیت، وسعتِ قلب و نظر نے مولانا کو اپنی منزل خود متعین کرنے میں بڑی مدد فرمائی۔

حضرت مولانا کی فطرت میں بچپن ہی سے دین اسلام کی ترویج و اشاعت میں نئے طریقوں کی تلاش جو زمانہ کے مقتضائے حال کے مطابق ہو اور حدود اسلام سے باہر ہو موجود ہے اسی ذوق و شوق سے جب ندوہ میں معلم مقرر ہوئے تو عربی زبان کی تعلیم اور قرآن کی تدریس کا ایک انوکھا اور نیا طریقہ تلاش کرنے پر مجبور کیا۔ جو آگے چل کر ندوہ کی تدریسی خصوصیت بن گیا جس کے مفید اثرات اور سہل طریقۂ کار نے ندوہ سے بڑھ کر ملک و بیرون ملک اپنا ایک مقام پیدا کر لیا۔

اس کیلئے ضرورت تھی ایک نئے نصاب تعلیم کی۔ حضرت مولانا نے کسی کی طرف نہ دیکھتے ہوئے اپنے ہی ادب اسلامی کو مشعل راہ بنا کر تصنیفی لائن میں قدم بڑھایا۔ تصنیفی ذہن مولانا کو ورثہ میں ملا تھا۔ ندوہ کے قیام میں اُردو عربی دونوں زبانوں میں لکھنا شروع کیا اپنے اس علمی سفر میں اپنے دائرہ کو وسیع تر بنانے کی کوشش کی۔ نتیجتاً مولانا کا ادبی ذوق نکھرتا اور سنورتا گیا شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ مولانا آگے چل کر عالم اسلام کی قیادت کا فریضہ انجام دیں گے سب سے پیشتر حضرت مولانا کی تصنیفی کتاب (سیرت سید احمد شہیدؒ) منظر عام پر آئی۔ اس کتاب نے مولانا کی زندگی کو انقلاب انگیز بنا دیا یہ دینی، فکری، علمی حلقوں میں مقبول عام ہو گئی۔ مولانا کے قلب میں ایک دیرینہ تمنا تھی کہ عربی ادب میں ایک ایسی کتاب مرتب کی جائے جو قرن اوّل سے لے کر عصر حاضر تک کے اعلیٰ نمونوں پر مشتمل ہو، چنانچہ اس تمنا کی تکمیل (مختارات) کی شکل میں

منظر عام پر آئی اور جلد ہی اس کتاب نے عرب وعجم کے یونیورسٹیوں کالجوں اور عربی مدارس میں اپنی افادیت کا لوہا منوالیا۔

القراۃ الراشدہ جس کا عربی ادب پڑھنے والے کے لیے سہل اور دینی اعتبار سے نتیجہ خیز ہے ثابت ہوا قصص النبیین جس میں الفاظ کا ذخیرہ کم سے کم ہے اس کتاب کی زبان قرآن کی زبان کے طرز پر ہے بچے اس کتاب کو پڑھ کر کفر وشرک سے متنفر اور ایمان وتوحید کی محبت، انبیاء علیہم السّلام کی عظمت ان کے قلوب میں راسخ ہوجائے چنانچہ اس کتاب نے ادبی، دینی حیثیت سے بہت جلد اپنی افادیت تسلیم کرائی۔

۱۹۵۰ء میں جب مولانا کی تصنیف (ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین) چھپ کر منظر عام پر آئی دنیائے عرب نے اس وقت حضرت مولانا کو ایک مفکر ایک ادیب کی حیثیت سے پہچانا اور حضرت مولانا کی محبّت عربوں کے قلوب میں جم گئی ـــــ حضرت مولانا کی ان چار تصنیفات کا حوالہ نمونہ کے طور پر پیش کیا گیا۔ ان کی جملہ تصنیفات کا احاطہ کرنا مختصر مقالہ میں ممکن نہیں۔ مولانا عربی، اُردو، دونوں ادبوں میں کسی لکیر کے فقیر نہیں، مولانا کا اپنا ایک انداز ہے مولانا کے ادب میں جو سوز وساز ہے وہ بہت کم ادباء کے یہاں نظر آتا ہے۔ مولانا کا قرآن کی زبان سے عشق حدیث نبوی سے لگاؤ صحابۂ کرام کے خطبات کو مولانا اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ سمجھتے ہیں، اسی وجہ سے مولانا عربی واردو ادب میں ایک منفرد مقام کے مالک بن گئے۔

حضرت مولانا کے مقالے فکر اُمّت، اصلاح اُمّت سے بھرپور ہیں اور ان کی دینی، علمی، عملی، ادبی بڑی اہمیت ہے۔ مولانا کی تصنیفات اور مقالوں نے پورے عالم کو استفادہ کے مواقع فراہم کئے، وہ چودھویں صدی کا ایک کرامتی کارنامہ ہے جس پر آنے والی نسلوں کو ایک مفید بامقصد زندگی کی راہ متعین کرنے میں دشواری نہیں ہوگی۔ (خطبات)

بیک وقت حق تعالیٰ کسی کو بھی تمام صفات سے نہیں نوازتے۔ کسی کو تصنیفی ذوق ملتا ہے تو کسی کو تدریسی، کسی کو تبلیغی کسی کو صحافتی، کسی کو تقریری کسی کو خانقاہی، لیکن حق تعالیٰ نے مولانا میں بیک وقت تمام ہی صفات کو جمع کر دیا۔ ادبی، تدریسی، تصنیفی، تبلیغی، تقریری،

خانقاہی ذوق عطا کیا۔حضرت مولانا نے دنیائے انسانیت کی حالتِ زار کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا اور اس تڑپتی ہوئی انسانیت کو دیکھ کر مولانا کا دل بھی بے چین ہوگیا۔لہٰذا آپ نے پوری انسانیت کی فلاح واصلاح کے لیے (پیام انسانیت) کے عنوان سے ملک میں جگہ جگہ بڑے بڑے اجتماعات میں انتہائی کرب وبے چینی کا اظہار کیا۔بلاتفریق مذہب وملت پوری انسانیت کو مخاطب بنایا ——— (تحفہ انسانیت) جو مولانا کی ہی تصنیف ہے صفحہ ۴۳ پر پوری انسانیت کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔خداتعالیٰ کا معاملہ نسل انسانی کے ساتھ اور انسانی نسل کا معاملہ نسلِ انسانی کے ساتھ بالکل برعکس ہے۔خداتعالیٰ نسل انسانی سے مایوس نہیں اس کی مہربانیاں، نعمتیں اس کائنات اور اس سنسار پر برس رہی ہیں۔

کائنات کی ہر چیز نسل انسانی سے پُر امید ہے لیکن ہمارا معاملہ یہ بتاتا ہے کہ ہم انسان سے مایوس ہیں ایک اجلاس میں مولانا نے بڑے ہی درد وفکر کے ساتھ مخاطب فرمایا تھا۔

میرا تعلق اس جماعت سے ہے جس نے جنگ آزادی میں بھرپور حصّہ لیا اور ملک وقوم کی آزادی کے لیے اس وقت جدوجہد شروع کی جب آزادی کا نام بھی کوئی نہیں جانتا تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ نیشلزم ایک تنگ خیالی ہے انسانیت اس سے بھی زیادہ وسیع تر چیز ہے تمام قومیں انسانیت کی شاخیں ہیں اصل چیز انسانیت ہے اس انسانیت کو تباہی وبربادی سے بچانے کے لیے کتنے افراد اور کتنی پارٹیاں آدمیت کے نام سے سرگرم ہیں۔تہذیب وتمدّن سیاست وحکومت، ادب وفلسفہ، اور علم وفن کے آشیانے انسانیت کی شاخ پر قائم ہیں۔ اگر انسانیت کی شاخ باقی ہے تو آپ جب چاہیں ویسا نشیمن بنالیں لیکن شاخ ہی نہ رہی تو نشیمن کی بقا کہاں؟

تحفۂ انسانیت صفحہ ۱۱۶ پر حضرت مولانا بڑے ہی زوردار انداز میں بے چینی کے ساتھ فرماتے ہیں، انسانیت کی کشتی گرداب میں ہے اس پر نسل انسانی کا صدیوں کا قیمتی سرمایہ ہے۔ تہذیب وثقافت، ادب وکلچر علوم وفنون سب خطرہ میں ہے کشتی غرقاب ہوگئی تو کچھ بھی نہیں بچے گا۔تھوڑا آگے چل کر مولانا فرماتے ہیں۔اس وقت ہندوستان کو آپ کی ذہانت آپ

کی قانون دانی، آپ کی محنت اور آپ کی بے حد ضرورت ہے یوں سمجھئے کہ ایک کشتی ایک ناؤ طوفان میں پھنس گئی ہے خوفناک لہریں منھ کھولے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہی ہیں اس کشتی میں کچھ کمزور لوگ سوار ہیں، کشتی ڈوبنے کے بالکل قریب ہے ایسے وقت میں کوئی ایسا ملاّح ایسا کھیون ہار آجائے جو اس کشتی کو پار لگادے تو وہ بہت بڑا محسن ہوگا۔

آپ نے انسانیت کے عنوان پر ملک بیرون ملک بے شمار خطبات دیئے اس سے ہوا کا رُخ پلٹا لیکن انسانیت کی ذمہ داری قیادت اصلاح، کی فکر اہل اسلام کی ذمّہ داری ہے اس لیے آپ نے سب سے بیشتر ہندو بیرون ہند میں جگہ جگہ انسان کی خیر اُمّت، داعی کی حیثیت کو بڑے درد و سوز کے ساتھ متوجہ کیا ــــــ کاروانِ زندگی حصّہ سوم صفحہ ۲۳ پر مولانا فرماتے ہیں اگر اس امّت نے احتساب کائنات کا فریضہ چھوڑ دیا اور اس نے اپنے کو عام انسانوں کی علمی و فکری قیادت سے سبکدوش کر لیا تو یہ نوعِ انسانی پر ظلم عظیم ہوگا اس لیے اگر آج ہمارے اہل فکر ہمارے جامعات کے فضلاء، ہمارے ادباء، شعراء، اہل قلم اور دانشورانِ قوم اپنے گوشۂ عافیت میں نہ بیٹھ جائیں اور نوع انسانی کی علمی، فکری، قیادت کا کام چھوڑ دیں تو نوعِ انسانی کا تو خسارہ ہوگا ہی مگر ملک بھی نقصان سے نہ بچ سکے گا۔

یقیناً جس شخص نے جزیرۃ العرب، سعودیہ، مصر، شام، اردن، کویت، ایران، مغرب اقصیٰ، یورپ، امریکہ، برطانیہ، ہندو پاک کے سینکڑوں سیمیناروں، کانفرنسوں تبلیغی اجتماعات و علمی مراکز میں ملّت اسلامیہ کے ہر فرد کو بڑی ہی دلسوزی کے ساتھ پکارا بھیلا اور اس کے جو اثرات مرتب ہوئے وہ چودھویں صدی کا مجددانہ کارنامہ ہے۔ انسانیت کا پیغام، داعی اسلام کا مقام یہ دو نمونے تقریری شکل کے لیے ابھی ابھی پیش کیے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اجلاس میں آپ نے پوری ملّتِ اسلامیہ کے آئے ہوئے عرب و عجم کے نمائندوں کو مخاطب کرتے ہوئے خطبۂ استقبالیہ میں فرمایا تھا ــــــ روایتی طریقوں سے ہٹ کر یہ خطبہ تاریخی مطالعہ، علمی جائزہ، تجربہ دعوت و فکر و عمل کی حیثیت رکھتا ہے اس کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔ جس میں خلوص للّٰہیت کے ساتھ بے نیازی حقیقت پسندی،

شانِ بزرگانہ، اہلِ مروّت کی دولت سے بے اعتنائی اور ایمان ویقین پر پختگی اپنی کچی جھونپڑی پر خود اعتمادی دوسرے کے شاہی محلّات سے بے نیازی کی جھلک نظر آتی ہے، کاروانِ زندگی کے حصّہ دوم کے صفحہ ۸۷ پر ملاحظہ فرمائیں۔ ۲۱، ۲۲، ۲۳ر مارچ کو دارالعلوم دیوبند کا جشن صد سالہ منعقد ہوا یہ اجلاس اپنی تاریخی حیثیت سے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اس میں ماضی کی سو سالہ تاریخ کا جائزہ بھی لیا گیا اور مستقبل میں اسلام کی عظمت دینی تعلیم کی مزید افادیت پر سوچ وفکر اور دارالعلوم دیوبند کے فضلاء، علماء کی عالم اسلام میں دینی، تبلیغی، اصلاحی، تعلیمی جہادی، کوششوں سے عالم اسلام کو روشناس کرایا، دارالعلوم دیوبند کی عالمی شہرت اور بین الاقوامی خدمات نے ہندوبیرون ہند کے خواص وعوام کا ایک جم غفیر اکٹھا کر دیا اس میں جیّد علماء اکابر کی تقریریں ہوئیں اور ملّت اسلامیہ کو بڑا فائدہ پہونچا لیکن اس پورے اجلاس کی روح حضرت مولانا ندوی مدظلہٗ العالی کی وہ تاریخی تقریر ہے جو صد سالہ اجلاس کا ماحصل تھا اس کا اقتباس پیش خدمت ہے۔ (کاروانِ زندگی) صفحہ ۳۰۸ پر ملاحظہ فرمائیں۔

اگر اجازت دی جائے تو میں بڑے ادب کے ساتھ ایک بات اور عرض کروں گا وہ یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان خدا کے فضل سے بڑی حد تک اسلام کے معاملہ میں خود کفیل ہیں وہ اسلام کے اوّلین وحقیقی سرچشموں کتاب وسنّت اور اسلام کے اوّلین علمبرداروں کی سیرت وکردار ان کی قربانی وایثار اور ان کی اولوالعزمی وحوصلہ مندی کی جلائی ہوئی شمع سے روشنی حاصل کرتے ہیں انھوں نے اپنا عقیدہ وایمان اپنی جان ومال کو اسلام کے چمکتے ہوئے سورج کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ مسلم اقوام یا عرب ممالک کے ابھرتے ڈوبتے ستاروں یا ٹمٹماتے چراغوں سے نہیں ہم آنکھ بند کرکے ان میں سے کسی کی انگلی پکڑکر چلنے والے نہیں ہیں نہ انھوں نے ان میں سے کسی کے اسلام کے ساتھ وفاشعاری کو اپنی وفاشعاری کی شرط قرار دی ہے۔ انھوں نے اللہ کے بھروسہ پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کو اسلام اور اسلامی تعلیمات کو اپنے سینہ سے لگائے رکھنا ہے۔ خواہ دنیا کی کوئی قوم عرب ہو یا عجم اس سے بے تعلقی یا روگردانی اختیار کرے۔

اگر عرب یا دوسرے ممالک کے مسلمان اپنی پرانی تہذیبوں اور قدیم فلسفوں کے سحر میں گرفتار

ہو جاتے ہیں اور ان کا دم بھرنے لگتے ہیں تو ہم انشاء اللہ وحدتِ اسلامی اور شریعت اسلامی کا دم بھرتے رہیں گے ہم اسلامی اصولوں اور اسلام کے مسلک زندگی کے معاملہ میں کسی قسم کا سودا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں ہم صاف اعلان کرتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ بھی اعلان کریں کہ ہم ایسے جانوروں کی زندگی گزارنے پر ہرگز راضی نہیں جن کو صرف راتب اور تحفظ چاہیے ان کو کوئی مارے نہیں ہم ہزار بار ایسی زندگی گزارنے اور ایسی حیثیت قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں ہم اس سرزمین پر اپنی اذانوں اور نمازوں کے ساتھ رہیں گے بلکہ ہم تراویح اور اشراق و تہجد تک چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے ہم ایک ایک سنّت کو سینے سے لگا کر رہیں گے۔ ہم رسول اکرمؐ کی سیرت کو سامنے رکھ کر کسی ایک نقش بلکہ کسی نقطہ سے بھی دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

مسئلہ ایک مدرسہ یا کسی جامعہ کا نہیں نہ کسی مکتب خیال نہ کچھ منصوبوں اور عمارتوں کی تکمیل کا ہے۔ بلکہ مسئلہ علوم ایمانی کے باقی رکھنے اور اسلامی شخصیت کے تحفظ کا ہے۔ آپ دوسروں کے پیچھے چلنے کے لیے ہرگز پیدا نہیں کیے گئے اور نہ خدا نے آپ کو اس ملک میں اس لیے بھیجا ہے کہ آپ دوسروں کے حاشیہ بردار ہوں اور آپ لوگوں کے چشم و ابرو کو پہچاننے کی کوشش کریں کہ ملک کس رخ پر جا رہا ہے ہم کسی قومی دھارے سے واقف نہیں ہم تو صرف اسلامیت کے دھارے کو جانتے ہیں ہم تو دنیا کی قیادت و امامت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔

حرفِ آخر

لہٰذا تین سو سالہ علمی، تصنیفی خاندان میں پیدائش، گھر کے مخلص افراد کی صحیح تعلیم و تربیت بزرگوں اور دنیائے اسلام کے چنیدہ ادبا سے روابط، حضرت مولانا کے جوہرِ فطری، حق شناسی نے دنیائے اسلام کا بہترین ادیب بنا دیا۔

اس عظیم شخصیت کے خطبات، مقالات و ادب پر پوری دنیائے اسلام کو ناز بھی ہے اور بھروسہ و اعتماد بھی، حضرت مولانا کی شخصیت سے مختلف مکاتب فکر نے ادبی، نظری، علمی،

فکری، تبلیغی، استفادہ کیا، میرا ذاتی تجربہ ہے کہ حضرت مولانا نے کسی بھی بخل سے کام نہیں لیا۔ مولانا سب کے کام آئے اور حضرت مولانا کی وسعت نظری، بلندی فکر و نظر نے مولانا کو اکابر کا محبوب العلماء، خواص کا مرجع عوام کا رہبر بنا دیا۔ جماعتوں کی زندگی کی حضرت مولانا علامت بن گئے مولانا کی معتدلانہ، اصابت رائے اور فکرِ صحیح سب کے لیے نسخۂ کیمیا ثابت ہوا۔ حضرت مولانا کے ادب میں فکر امت ہے اصلاح معاشرہ ہے اور جدید و قدیم میں میل ملاپ بھی۔

حضرت مولانا کے ادب میں فکرِ اسلامی، توحید پر پختگی، اتباع سنّت کا جذبہ، ائمہ کرام کی عظمت، مجددین و مصلحین کی تڑپ علما و طلبا سے شفقت، جماعتوں سے لگاؤ۔ ہر مکتبۂ فکر سے نباہ، اپنوں کے مشفق، سب کے مخلص یہ سب صفات مولانا کی تحریر تقریر میں کثرت سے ملیں گی اسی وجہ سے حضرت مولانا اس وقت کے بہترین ادیب، مصلح اور مقتدا ہیں۔ آخر میں مولانا کی صحت و عافیت کی دعا کے ساتھ قلم روکتا ہوں اور علامہ اقبالؒ کی اس صدا کے ساتھ بات ختم کرتا ہوں ؎

اثر کرے نہ کرے سن لے تو میری فریاد
نہیں داد کا طالب یہ بندۂ آزاد

سرور عالم ندوی
ریسرچ اسکالر (شعبۂ عربی)
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شبلی کی سوانح نگاری

ایک تجزیاتی مطالعہ

اقوام وملل کی تاریخ بتاتی ہے کہ قوموں اور ملتوں کی عظمت وتوقیر کی داستان تاریخ انسانیت کا وہ مقدس صحیفہ اور نسل آئندہ کی تعلیم وتربیت کا وہ روشن باب ہے جو شعور واحساس کی منزلوں میں قدم رکھتے ہی ابن آدم کے دلوں میں کروٹیں لینے لگا تھا اور اس امانت کے تحفظ وبقا کے لیے وہ مضطرب اور پریشان ہو گئے تھے خاص طور سے روم ویونان کے باشندے اپنے آباء واجداد کی عظمتوں کو باقی رکھنے اور دنیا والوں کو ان کی قدر ومنزلت سے واقف کرانے کے لیے بیتاب نظر آنے لگے جس کے نتیجہ میں انسانی عظمت وتوقیر کا ایک بڑا ذخیرہ وجود میں آگیا، اور Memorise of Secrates Xenophon کی جو پہلی صدی عیسوی کی یادگار ہے پہلی مرتبہ سوانح عمری کی شکل میں نمودار ہوئی، اس کے بعد دوسری صدی عیسوی میں پلوٹارک نے اپنی کتاب "Parallal lives" کے ذریعہ اس عمل کو مزید تیز کر دیا جس میں ۴۶ یونانیوں اور رومیوں کے حالات زندگی کو جمع کیا گیا ہے، لیکن ان کی تمام تگ ودو اور کوششوں کے باوجود انکا دائرہ کار محض چند غیر یقینی شخصیات کی زندگی کے متفرق نقوش سے آگے نہ بڑھ سکا، جس کی صداقت پر بھی کامل یقین نہیں کیا جا سکتا، لیکن چھٹی صدی عیسوی میں جب مطلعِ کائنات پر اسلام کی کرنیں پھیلنی شروع ہوئیں تو قرآن مقدس کے نزول نے

نحن نقص علیك أحسن القصص، کے ذریعہ خدا کے برگزیدہ بندوں کے حالات اور گذشتہ قوموں کے واقعات کا ایک معتبر اور قابل اطمینان مجموعہ تیار کر دیا، نیز اصحاب رسول کی متبرک جماعت اپنے پیارے محبوبؐ کی زندگی کے ایک ایک عمل اور زبان اطہر سے نکلے ایک ایک قول کو مرتب کر کے اگرچہ اس فن پر کام کرنے والوں کے لیے رہنمائی کا سراغ ضرور فراہم کر دیا تھا، جس کے ذریعہ حضرات تبع تابعین نے دوسری صدی ہجری میں راویان حدیث کی تحقیق و تفتیش کا عمل اس قدر تیز کر دیا کہ وہ فن سے قریب ہوتا نظر آنے لگا، لیکن اب بھی اس اسلوب وطرز تحریر نے نہ تو فن کی حیثیت اختیار کی تھی اور نہ ہی اس کے لیے سوانح وبایو گرافی Biography کا لفظ استعمال ہوا، بلکہ یہ اصطلاح سب سے پہلے ۱۹۶۱-۶۲ء میں ادبی طور پر مطلع ادب پر نمودار ہوئی اور فن سوانح نگاری کا سہرا ڈاکٹر جانسن کے سر باندہ دیا گیا جنھوں نے "حیات سادیج" لکھ کر سوانح نگاری کو فن کے طور پر برتا اور لوگوں کو یہ بتایا کہ یہ انتہائی دلچسپ اور اہم صنف نثر ہے جس کے ذریعہ فن اور ادب دونوں کی خدمت کی جاسکتی ہے۔

گویا اس نے اس کتاب کے ذریعہ فن اور ادب دونوں کو سوانح نگاری سے وابستہ کر دیا اور یہی اس اسلوب وطرز تحریر کا مقصد وماحصل بھی ہے، جیسا کہ اس کی تعریف سے واضح ہوتا ہے، آکسفورڈ ڈکشنری میں اس کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

The history of the lives of individual men as a branch of litrature (1)

یعنی سوانح حیات بطور ایک ادبی صنف کے کسی شخص واحد کی زندگی کا تاریخی مطالعے کا نام ہے۔

گویا اس تعریف نے تاریخ اور ادب دونوں کو اپنے جلو میں سمیٹ کر یہ باور کرا دیا کہ فن سوانح نگاری ایک ایسا شجر نوبہار ہے جس کی جڑیں ادب اور تاریخ دونوں سے وابستہ ہیں، جو کرب وکیف، عروج وزوال، ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کا آئینہ دار ہوتا ہے، جسے انتہائی دیانتداری اور غیر جانب داری کے ساتھ برتا جاتا ہے، جس میں فرد یا شخص مرکزی اہمیت کا حامل ہے، اور یہی وہ جز ہے جو سوانحی ادب کو تاریخ سے الگ کرتا ہے، اس لیے کہا گیا ہے کہ ایک

سوانح حیات بہترین تاریخی مواد کی حامل ہوسکتی ہے، لیکن تاریخ کسی کی سوانح حیات نہیں ہوسکتی۔

یہی وہ بین فرق ہے جو ہمارے اقلیم سخن کے شہنشاہ علامہ شبلیؒ کے ہمیشہ پیش نظر رہا، جس کو نہ سمجھنے کی صورت میں شبلیؔ سوانح نگاری میں کم حیثیت اور تاریخ کو ان کا لقمۂ تر بتایا جاتا ہے جس کے بغیر شبلی ایک قدم نہیں چل سکتے،

فنّی اعتبار سے دیکھا جائے تو بلاشبہ سوانح نگاری اور تاریخ نویسی کے فنون کسی حال میں بھی ایک دوسرے سے لگا نہیں کھاتے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تاریخ نویسی اور سوانح نگاری میں قدر مشترک رشتہ پایا جاتا ہے، بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ تاریخ ایسا بحرِ زخار ہے جس کی کوہ پیما موجوں نے سوانح نگاری کی راہ نکالی جن کا مقصد حال کی تغیر اور مستقبل کی تعمیر کے حوالے سے ماضی کی بازیافت ہے، یہی وہ نکتہ ہے جس نے کارل بیکر Carl Becker کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ تاریخ اقوال و افعال انسانی کا نام ہے، جس کے بعد تاریخ و سوانح نگاری کا رشتۂ اتصال مزید پختہ ہوجاتا ہے، یہی وہ نظریہ ہے جو شبلیؔ کے ذہن میں ہمیشہ رقص کرتا رہا اور سوانح نگاری کے وقت بھی ان کے ذہن میں تاریخ کا خیال منڈلاتا رہا، جس کا ثبوت خود ان کی تحریریں ہیں، مثلاً المامون کا دوسرا حصہ شروع کرتے ہوئے یوں رقم فرمایا" ہماری تاریخ کا پہلا حصہ گو نہایت معتمد اور مستند تاریخوں سے ماخوذ ہے اور اس اعتبار سے وہ ان تمام تاریخوں کا ایسا جامع انتخاب ہے جس سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا تاہم وہ مامون کے عہد سلطنت کی ایک رخی تصویر ہے۔(۲)

اس عبارت سے میرا مقصود شبلی کے نظریۂ تاریخ و سوانح نگاری کو واضح کرنا ہے، اس اعتراف کے ساتھ کہ بلاشبہ تاریخ جو بے حد نازک مزاج ہے خلاف مزاج کوئی بات برداشت نہیں کرسکتی، کون ہے جو المامون کو فہرست سوانح سے نکال دے؟

یقیناً شبلی کو تاریخ سے عقیدت ضرور ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ تاریخ کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتے بلکہ شبلی وہ نابغۂ روزگار شخصیت ہیں جن کے متنوع اور متفرق پہلو ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور

ان کی کشور کشائی ہر فن اور ہر موضوع پر یکساں نظر آتی ہے، انھوں نے اپنے اشہب خامہ کا رخ علم و فن کی جس وادی کی طرف پھیرا وہاں اپنی فتح و کامرانی کا پرچم لہرا دیا، ان کے طائر تخیل نے کبھی فلسفہ و تاریخ کے ریگ زاروں پر پرواز کیا تو کبھی تحقیق و تنقید کے کوہساروں پر سایہ فگن ہوا کبھی چمنستان شعر و ادب کو اپنا آشیانہ بنایا تو کبھی قوموں کی شکست خوردگی احساس کمتری اور زبوں حالی کو دور کرنے کے لیے ہما کا روپ اختیار کیا اور جس کوچہ میں قدم رکھا اسے گلزار براہیمی کا ہمسر بنا دیا، جس فن پر قلم اٹھایا اسے اس فن کا مقدس صحیفہ قرار دیا گیا، لیکن چونکہ تاریخ ان کے گھر کی لونڈی رہی اور ادب ان کا ہمزاد، اس لیے ان دونوں نے کبھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا، ان کی جولانی طبع نے ہر کوچہ کی سیر کرائی، کبھی شعر و سخن کی مجلسیں آراستہ کیں تو کبھی فلسفہ و علم کلام کی گتھیاں سلجھائیں کبھی نظام تعلیم و تربیت کی طرف توجہ مبذول کی تو کبھی مغرب کی فریب کاریوں کا پردہ فاش کیا، لیکن جب اس نے مڑ کر اپنی قوم کی خستہ پائی پریشان حالی اور ان سب سے بڑھ کر جنگ آزادی میں شکست خوردگی کے بعد احساس کمتری کو دیکھا تو خون کے آنسو بہا دیئے اور ان کی اصلاح و درستگی کی فکر کی، عزم و حوصلہ کا درس دیا اور تاریخ اسلام کی باوقار شخصیتوں اور اسلاف کی سوانح عمریوں کو اس مرض کا علاج تصور کیا، اس کیلئے اس نے انھیں کبھی ایوان شاہی کا طواف کرایا تو کبھی عظمت و جلال کے کوہ گراں کی سیر کرائی، کبھی ارباب قلب و نظر کی خانقاہوں سے گزرا تو کبھی علماء اور فقہاء کی بابرکت و پرنور مجلسوں میں جا بٹھایا، کیونکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ "دوسری قوموں کی ترقی یہ ہے کہ آگے بڑھتے جائیں آگے بڑھتے جائیں، لیکن مسلمانوں کی ترقی یہ ہے کہ وہ پیچھے ہٹتے جائیں پیچھے ہٹتے جائیں یہاں تک کہ صحابہ کرام کی صف سے جا ملیں۔ (۳)

یہی وہ نظریہ تھا جس کی وجہ سے ان کے قلم گوہر بار اور علم و تحقیق کے درشہوار نے عباقرۂ روزگار کے لافانی کارناموں کو مرصع ہار بنا کر احساس کمتری کی شکار قوم کو آراستہ کر دیا، کیونکہ سوانح نگاری کے سلسلہ میں وہ کارلائل کے اس نظریہ کے حامی تھے کہ تاریخ غیر معمولی شخصیتوں اور نامورروں کے غیر مختتم سلسلہ کا نام ہے۔ (۴)

The history of the world is

hul - the biography of great men (۵)

یہی وجہ ہے کہ بقول مولانا سعید احمد اکبر آبادی مولانا شبلی نعمانی جو اپنے وقت بلکہ کہنا چاہیئے کہ اردو ادب کے ہر عہد کے سب سے بڑے سیرت نگار و سوانح نویس تھے جو اسلامی تاریخ کو سوانح و سیرت کی عینک سے دیکھتے تھے اور اسلامی تہذیب و تمدّن کی تشکیل میں ابطال کے عطایا اور کارناموں کا تجزیہ منصوبہ بندی کے ساتھ پیش کرنا چاہتے تھے، چنانچہ ان کی بیشتر تصانیف سوانح عمری کے فن کے ذیل میں آجاتی ہیں۔ (۶)

لیکن بقول الطاف فاطمہ شبلی کے سوانحی موضوعات حاؔلی کی طرح خاموش اور نسبتاً سہل نہیں ہیں شبلی کو چٹانوں سے ٹکرانے میں مزہ آتا تھا وہ شیروں کے کچھاروں میں گھس جانے کے قائل تھے، ساتھ ہی ان کی شاہانہ طبیعت محلّات کے نظاروں سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی اس لیے انھوں نے وہ موضوعات منتخب کیے جن کی عظمت وجلال کے آگے بڑے بڑے سر جھک چکے تھے، انھوں نے فاروق اعظمؓ کی سوانح عمری لکھی، شاہان اسلام میں ان کی نظر اس عہد پر پڑی جس میں روم وایران کی فضائیں سمٹ کر یکجا ہوگئی تھیں اور المامون کو وجود بخشا (۷)۔ علماء میں ابوحنیفہؒ اور غزالیؒ کا انتخاب کیا۔ اور متکلمین اسلام میں مولانا روم کی سوانح لکھ کر دنیا کو حیرت واستعجاب کا پتلا بنا دیا کہ اس سے پہلے دنیا انھیں صرف فقر وتصوّف کا امام تصوّر کرتی تھی، نیز ان کی مثنوی کو اسرار نہانی کا خزینہ اور کشف صدور کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا لیکن شبلی نے اسے ایک دوسری حیثیت سے پیش کیا ہے۔

یہ وہ شخصیات ہیں جن کے لکھنے میں شبلی کو غایت درجہ دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا، کیونکہ عموماً قدیم موضوعات کے انتخاب میں مواد کی فراہمی انتہائی مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے، ایسی سوانح عمریوں کا دار و مدار صرف مصنّف کی تحقیق، مواد کی فراہمی، واقعات کے انتخاب اور حسن ترتیب پر ہوتا ہے، جس میں شبلی یکتا و تنہا نظر آتے ہیں، کیونکہ انھوں نے اپنی تمام سوانحی کتابوں میں سوانح نگاری کے اصول و ضوابط کو ہمیشہ مد نظر رکھا ہے، ہر جگہ روایت کے ساتھ درایت یعنی عقلی اصولوں سے واقعہ کی تنقید کرتے ہیں، جس کا ذکر انھوں نے الفاروق کے مقدّمہ میں تفصیل

سے کیا ہے، ان کی پوری تحریر میں کہیں بھی دیانت داری اور غیر جانب داری کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا ہے بلکہ فن کو عقیدت پر ترجیح دی ہے اور بے باکی ہمہ گیری اور غیر جانبداری کا ایسا مرقع تیار کیا ہے جس میں حقیقت زیادہ اور اعتقاد کم ہے، لیکن اسے کیا کیا جائے کہ ان سب کے باوجود بعض مدعیان فن وادب کے نزدیک شبلی کا دامن اب بھی مدلل مدّاحی سے پاک نہیں اور ان کا سیال و بے باک قلم اپنے ہیرو کی مدحت سرائی سے تھکتا اور بھرتا نہیں، حتیٰ کہ ڈاکٹر سیّد عبداللہ صاحب کو شبلیؔ کی سوانح عمریوں میں معائب کی تصویریں دھندلی نظر آئیں اور ان کے نزدیک شبلیؔ سوانح نگار کے اس فرض سے عہدہ برآ نہیں ہوئے کہ جس کے ذریعہ موضوع کی تصویر کے دونوں رخ دنیا کے سامنے آجاتے، نیز شبلی کو دعویٰ ہے کہ انھوں نے کریٹیکل بایاگرافیاں لکھی ہیں۔ مگر ناموروں کی ناموری کا طلسم اس درجہ ان پر غالب ہے کہ انھیں اپنے ناموروں کی کمزوریاں بیان کرتے ہوئے ذرا حجاب سا محسوس ہوتا ہے۔[8]

حیرت اس بات پر نہیں کہ یہ کیسے لکھ دیا گیا افسوس اس کا ہے کہ اس کا صدور ان لوگوں کی جانب سے ہوا ہے جنھیں دعوائے سخن فہمی نہیں ادعائے سخن وری بھی ہے۔

اے کاش شبلی کی یہ تحریر ان لوگوں کی نظروں سے گزری ہوتی تو شاید اس قسم کی ستم ظریفی کا مظاہرہ نہ ہوتا جو مناقب عمر بن عبدالعزیز پر ریویو کے دوران شبلی کے حقیقت پسند قلم سے نکلی کہ سوانح نویسی کے فرائض میں جو بڑا فرض مصنّف سے رہ گیا وہ تنقید ہے یعنی مصنّف نے اپنے ہیرو کی صرف خوبیاں دکھائی ہیں، اس کے کسی قول و فعل پر کسی قسم کی نکتہ چینی نہیں کی ہے، لیکن یہ اس زمانہ کے تمام سوانح نگاروں کا انداز ہے۔[9]

بھلا وہ جس کا نظریہ یہ ہو وہ خود سوانح نگاری میں ہیرو کے محاسن و معائب کو پیش کرنے سے کیسے ہچکچاہٹ محسوس کر سکتا ہے، اور اگر لکھنے میں یہ جرأت نہ ہو تو بقول جانسن ایسے موضوع کو چھوڑ دینا چاہیئے۔

when it is painful to tell the truth the story must not be told[10]

لیکن شاید ہمارا صرف یہ بیان ان کے غیر جانبدار ہونے کے لیے کافی نہ ہوگا جب تک کہ ان کی سوانحی کتابوں سے وہ اقتباسات نہ پیش کر دیئے جائیں جو ان کی غیر جانبداری کی سچی تصویر ہیں اور معاندین شبلی کے خود ساختہ اعتراضات کے جوابات بھی۔

اس سلسلہ میں ان کی پہلی سوانحی کتاب المامون کا جائزہ لیتے ہیں جو ان کا محبوب ہیرو ہے کیا واقعی شبلی سوانح نگاری میں غیر جانب دار تھے؟

انھوں نے تحریر فرمایا ہے ــــــ امین نے جب اپنے نمک خوار غلام احمد بن سلام سے پوچھا مامون کا کچھ حال معلوم ہے؟ اس نے کہا زندہ ہے، امین کہنے لگا خدا پرچہ نویسوں کا برا کرے کم بختوں نے خبر دی تھی کہ مر گیا[۱۱] اس کے برخلاف جب مامون کی خدمت میں امین کا کٹا ہوا سر پیش کیا گیا تو اس نے اپنے بھائی کے خون آلود سر کو مسرت کی نگاہ سے دیکھا اور جوش خوشی سے سجدۂ شکر ادا کیا[۱۲] اس تحریر کو پڑھنے کے بعد امین کی عظمت کے آگے مامون انتہائی کم ظرف نظر آتا ہے، اگر شبلی چاہتے تو اس واقعہ کو یا تو غائب کر دیتے یا پھر اس کی ایسی تاویل کرتے جو مامون کی عظمت کا سبب بن جاتی۔

اسی کتاب میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں ــــــ مذہبی جوش ایک بڑی طاقت ہے اور ہمیشہ دنیا میں اس سے عجیب عجیب اثر ظاہر ہوتے ہیں مگر افسوس ہے کہ مامون نے اس قوت سے کوئی کام نہیں لیا، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ جس چیز نے اس کی تمام خوبیاں غارت کر دیں وہ یہی مذہبی جنون تھا[۱۳]

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ خوبیوں کے ساتھ شخصی اقتدار میں اس سے بعض ایسی بے اعتدالیاں سرزد ہو گئی ہیں جن کا خیال کر کے دل کانپ جاتا ہے اور دفعتاً اس کی تمام خوبیاں آنکھوں سے چھپ جاتی ہیں[۱۴]

کون ہے جس کو اپنے محبوب کی مدحت سرائی اچھی نہیں لگتی لیکن شبلی کا حقیقت نگار اور غیر جانب دار قلم اسے برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں، امام ابوحنیفہؒ کے تذکرے میں لکھتے ہیں، ہمارے تذکرہ نویسوں نے امام کے اخلاق وعادات کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں خوش

اعتقادی اور مبالغہ کا اس قدر رنگ بھرا ہے کہ امام صاحب کی اصل صورت اچھی طرح پہچانی نہیں جاتی، چالیس برس تک عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی، تیس برس تک مسلسل روزہ رکھا جہاں وفات کی اس جگہ سات ہزار بار قرآن ختم کیا۔ یہ اور بہت سے افسانے ان کی نسبت مشہور ہیں اور لطف یہ ہے کہ ہمارے مؤرخین انھیں دور از کار قصّوں کو امام کے کمالات کا جوہر سمجھتے ہیں حالانکہ یہ واقعات نہ تاریخی اصول سے ثابت ہیں اور نہ ان سے کسی کے شرف پر استدلال کیا جا سکتا ہے[۱۵]۔

ایک جگہ لکھتے ہیں ـــــ امام ابو حنیفہ مجتہد تھے پیغمبر نہ تھے، اس لیے ان کے مسائل میں غلطی کا ہونا ممکن ہے نہ صرف امکان بلکہ ہم وقوع کا دعویٰ کر سکتے ہیں[۱۶]۔

اسی طرح الفاروق جسے وہ اپنی زندگی کا کامیاب ترین اثاثہ تصوّر کرتے تھے اور اس میں اپنے ہیرو کی شخصیت کو اجاگر کر کے ایک ذہنی تسکین حاصل کرتے ہیں اور ہر مقام اور ہر جگہ پر اپنے ہیرو کی رفاقت کو باعث افتخار سمجھتے ہیں لیکن اس کے باوجود جہاں کہیں بھی کوئی کمزور پہلو دکھائی دیا اس کا برملا اظہار کر دیتے ہیں اور اس کے بیان میں قطعاً ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے، مثلاً جب حضرت عمرؓ پر یہ الزام لگایا گیا کہ انھوں نے حضرت فاطمہؓ کو ان کے گھر میں آگ لگا دینے کی دھمکی دی تو شبلی نے جوشِ عقیدت میں آکر اس کی کوئی تاویل نہیں کی بلکہ یوں گویا ہوئے کہ "درایت کے اعتبار سے اس واقعہ کے انکار کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ حضرت عمرؓ کی تندی اور تیز مزاجی سے یہ حرکت کوئی بعید نہیں"[۱۷]۔

اسی طرح ان کی بشری کمزوریوں سے کہیں بھی چشم پوشی نہیں کی بلکہ بعض کمزوریوں کا صاف صاف اعتراف کیا ہے، مثلاً وہ نکاح کا خطبہ اچھا نہیں دے سکتے تھے، اسی طرح سچّے اور باعمل مسلمان ہونے کے باوجود انہیں اپنی آل اولاد خصوصاً ازواج سے رغبت نہ تھی یہاں تک کہ جس قدر عزّت عورتوں کی کرنی چاہیئے وہ نہیں کرتے تھے۔

نہ معلوم مذکورہ اقتباسات سے شبلی کی سوانح نگاری میں معائب کی تصویریں دھندلکے سے پاک ہوئیں یا اب بھی بے جا تعریف و توصیف کے پردوں میں ڈھکی ہوئی ہیں آیئے ذرا

غزالی کی جو کھٹ پر دستک دیں اور ان سے پوچھیں کہ شبلی آپ کو امام المتکلمین کہا کرتے تھے حجۃ الاسلام اور بحرِ ذخار قرار دیتے تھے ان کا معاملہ آپ کے ساتھ کیسا رہا تو یقیناً وہاں سے بھی یہی آواز آئے گی کہ شبلی اپنی خوش اعتقادی میں تصنیفی ایمانداری کو قربان نہیں کرتا، انھوں نے احیاء العلوم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ـــــــــــ اس میں بعض باتیں قابل مؤاخذہ ہیں جیسے احادیث کے نقل کرنے میں نہایت بے احتیاطی کی ہے سیکڑوں ہزاروں حدیثیں موضوع اور ضعیف نقل کردی ہیں، جن کا کتب حدیث میں کہیں پتہ نہیں احادیث پر موقوف نہیں بزرگان سلف کے متعلق جو واقعات لکھے ہیں اکثر دور از کار اور بعید از عقل ہیں اور بجز عوام کے کوئی شخص ان پر یقین نہیں کر سکتا، اسی کے ساتھ زہد اور مجاہدہ کے بیان میں ایسی باتیں لکھ دی ہیں جو اعتدال سے متجاوز ہیں[۱۸]

یہ وہ تحریریں ہیں جن کے بیان کے لیے بڑا دل گردہ درکار ہے ہر شخص کے بس کا نہیں کہ وہ ایک طرف تو عشق و محبت کا دعویٰ بھی کرے دوسری طرف عیب اور خامیوں کا افشا و اظہار بھی کرتا پھرے مگر اسے کیا کیجیے کہ فنکار کا فن انھیں راہوں سے گزر کر معراج کی منزلوں کو طے کرتا ہے، یقیناً شبلی نے سینہ پر پتھر رکھ کر یہ تحریریں قلم بند کی ہوں گی مگر اس میں ان کا کوئی دخل نہیں بلکہ اس حقیقت پسند شبلی کا قصور ہے جو اس قدر دلی ارادت کے باوجود اظہار رائے سے باز نہیں آتا۔

اسی طرح الفاروق پر ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کا ایک اعتراض یہ ہے کہ اس کا مقصد مغرب کے رجحان کا غیر معتدل احترام ہے، مثلاً واقعۂ بدر کو مدافعانہ ثابت کیا ہے تاکہ جارحانہ جہاد کے اعتراض سے بچ سکیں[۱۹] لیکن وہ حقیقت بیں نگاہیں جانتی ہیں جن کے سامنے اسلام کی مکمل تاریخ اور ابتدائی دور کے مسلمانوں کی پوزیشن واضح ہے وہ کسی بھی طرح اس پہلی جنگ کو جارحانہ قرار نہیں دے سکتیں کیونکہ یہ وہ وقت تھا جب مسلمانوں کی تعداد انتہائی مختصر تھی اور سوائے قوت ایمانی اور خدا کی ذات پر بھروسہ کے کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا جس کے بل بوتے پر وہ جارحانہ اقدام کرتے، ایسے وقت میں مسلمانوں کی مٹھی بھر جماعت صرف اپنی اور اسلام کی مدافعت کے لیے

قوت ایمانی کے ساتھ سینہ سپر ہوئی تھی، اس لیے یقیناً مدافعانہ ہے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ الفاروق میں حدیث پر معقولیت کو ترجیح دی گئی ہے[۲۰]۔ اس کے جواب میں الفاروق کا مقدمہ کافی ہے جس میں شبلی نے روایت اور درایت کی وضاحت کر کے اپنا نقطۂ نظر واضح کر دیا جس کے نہ سمجھنے کی صورت میں محض ارباب تقدس کو بھی اس عظیم تصنیف میں روحانیت کا فقدان نظر آتا ہے، حالانکہ پوری الفاروق میں دعوے کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ کوئی ایسی روایت نہیں مل سکتی جس میں شبلی نے صحیح حدیث پر عقل کو ترجیح دی ہو سوائے واقعہ قرطاس والی حدیث کے لیکن اس کے جو دلائل پیش کیے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اگر تعصب کا چشمہ اتار کر دیکھا جائے تو اس سے زیادہ سچی اور اچھی بات نہیں ہو سکتی، انھوں نے اس حدیث کے ذیل میں تحریر کیا ہے کہ بخاری اور مسلم کے کسی راوی کے متعلق یہ شبہ کرنا کہ وہ واقعہ کی پوری ہیئت محفوظ نہ رکھ سکا اس سے کہیں زیادہ آسان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ہذیان اور حضرت عمرؓ کی نسبت گستاخی کا الزام لگایا جائے[۲۱]۔

جیسا کہ ابتداء میں یہ بتایا گیا کہ مولانا کا ارادہ ایک مکمل تاریخ اسلام لکھنے کا تھا[۲۲] لیکن وقت کی قلت اور موضوع کی وسعت کے باعث ناموران اسلام کے حالات و کارنامے کو ہی منظر عام پر لانے کو ضروری خیال کیا گیا کہ یہی وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا تھا اور شخصیات کے انتخاب میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ ان افراد کی سوانح حیات لکھی جائے جو اپنے گوناگوں کمالات اور غیر معمولی کارناموں کی وجہ سے پورے عہد اور زمانہ کو سمیٹے ہوئے ہوں، اس میں نہ تو ذاتی تعلق کا خیال رکھا گیا ہے اور نہ ہی جذباتی لگاؤ کا، بلکہ حقیقت پسند نگاہیں آج بھی اس بات کی برملا گواہی دیں گی کہ شبلی نے جن شخصیات کو اپنی فہرست سوانح نگاری میں شامل کیا ہے وہ اپنی علمی لیاقتوں، جنگی مہارتوں اور بے لوث جذبۂ قربانی کی وجہ سے اس کی بہر اعتبار مستحق تھیں کہ انھیں ناموران اسلام میں جگہ دی جائے۔ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ سیرۃ النعمان کی وجہ تالیف بتاتے ہوئے حضرت سید سلیمان ندویؒ نے وہ لکھ دیا جس کو تسلیم کرنے کے لیے کسی طرح نہ تو دل تیار ہوتا ہے اور نہ ہی دماغ، وہ لکھتے ہیں، "ابتداء میں مولانا سخت حنفی تھے اور حنفی کہلانا

اپنے لیے موجب فخر سمجھتے تھے[۲۳] آگے لکھتے ہیں یہ کتاب درحقیقت مولانا کے اسی ذوق وشوق کی دوسری شکل ہے جو ان کو حضرت امام ابوحنیفہ اور ان کی فقہ سے تھا[۲۴] جس کی ترجمانی میں کسی نے ان کو کٹر حنفی قرار دیا کسی نے ابوحنیفہ نواز ٹھہرایا اور ان کی کتاب سیرۃ النعمان کو حنفی نامہ۔

شبلی کی حنفیت سے انکار نہیں لیکن کیا صرف جوش حنفیت نے ہی شبلی کو سیرۃ النعمان لکھنے پر مجبور کیا، کیا ان کے علمی کارنامے، اجتہادی شان، فقہی بصیرت اور قرآن وحدیث کی تہوں سے معانی اور مطالب کا استخراج نیز یکتا و تنہا فقہی مسائل کی تدوین اور تمام دوسرے فقہی مکاتب پر ان کی فوقیت اس کی متقاضی نہیں تھیں کہ اس نابغۂ روزگار کی سوانح حیات لکھی جائے اور ان کے ان ناقابل فراموش کارناموں کو عوام اور خاص طور سے مسلمانانِ عالم کے سامنے لاکر یہ باور کرایا جائے کہ یہ بھی اسی میکدے کے میخوار اور اسی خوان نعمت کے خوشہ چیں ہیں جس کے تم نگراں اور محافظ ہو مگر کیا وجہ ہے کہ تمہارے اندر وہ جوش عمل اور عزم وحوصلہ نہیں جو تمہارے آباو اجداد میں تھا۔

اسی طرح شبلی کی سوانحی کتابوں میں الغزالی اور سوانح مولانا روم ابتدا سے اب تک ناقدین ومبصرین کا موضوع بنی رہی ہے اور اس میں بیان کردہ حالات زندگی کے اختصار کے پیش نظر ارباب علم کے یہاں ایک بڑا مسئلہ یہ رہا ہے کہ اسے فہرست سوانح نگاری میں شامل بھی کیا جا سکتا ہے یا نہیں (مثلاً سوانح روم محض سوانح عمری کی حیثیت سے شبلی کی غالباً ناقص ترین تصنیف ہے[۲۶] الغزالی شبلی کی سوانحی کتابوں میں سب سے زیادہ کمزور ہے[۲۷] وغیرہ) ایسے وقت میں سب سے پہلے ذہن جس چیز کی طرف منتقل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ سوانح نگاری کے اصول وضوابط کیا ہیں۔ اس سلسلہ میں سعید انصاری کی وہ عبارت پیش کرنا چاہتا ہوں جو انھوں نے فن سوانح نگاری کے اصول بتاتے ہوئے رقم کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ مصنف اپنے ہیرو کے عام حالات زندگی بیان کرنے کے بعد اس کا سب سے نمایاں وصف اجاگر کرکے دکھائے، مثلاً نپولین کی لائف لکھنی ہے تو اس کے دیگر واقعات زندگی کو معمولی طور پر بیان کرنے کے بعد مصنف کا فرض یہ ہے کہ اس کے جنگی کارناموں اور دلیری اور بہادری کے واقعات کو تفصیل کے ساتھ

دکھائے۲۸؎

اس اصول کو سامنے رکھنے کے بعد الغزالی اور سوانح مولانا روم کا مطالعہ ایک سمت متعین کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔

میرا خیال ہے۔یہی وہ اصول سوانح نگاری ہے جس نے الطاف فاطمہ کو یہ لکھنے پر آمادہ کیا ہوگا کہ جہاں تک چھان بین اور تفتیش کا تعلق ہے شبلی یہاں بھی مستقل مزاج اور ثابت قدم نظر آتے ہیں اور سوانحی صداقت کا رکارڈ کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔اگرچہ شبلی کا مقصد سوانح نگاری نہ تھا اور نہ ہی انھوں نے زیادہ زور امام غزالی کی سیرت کو نمایاں کرنے پر دیا ہے تاہم موٹے موٹے واقعات کو اس طرح پیش کردیا ہے کہ ان کے بتائے ہوئے خاکہ پر چل کر کوئی بھی اچھا سوانح نگار اعلیٰ پیمانہ پر غزالی کی سوانح عمری لکھ سکتا ہے۲۹؎

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ مذکورہ بالا ان دونوں کتابوں میں سوانحی خاکہ نہایت مختصر ہے لیکن اس میں سب سے بڑا دخل مواد کی قلت کا ہے،شبلی کی کمزوری یہ ہے کہ وہ دریا کی طغیانی اور موجوں کی روانی میں آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں،ایسے وقت میں مرد غازی کے کارناموں کا اندازہ مفتوحات کی وسعت اور مال غنیمت کی فراوانی سے نہیں لگایا جاتا بلکہ اس کا اندازہ لگایا جاتا ہے ٹوٹی ہوئی تلوار بکھری ہوئی زرہ تپتے ہوئے صحرا اور دہکتے ہوئے سورج سے،کہ ان ناگفتہ بہ حالات میں اس نے مقابلہ کیونکر کیا،اور حقیقت بھی یہ ہے کہ غزالی اور مولانا روم کی سوانح حیات اور بھی کوئی شخص چاہتا تو آسانی سے لکھ سکتا تھا لیکن دونوں میں جو فرق ہوتا اس کا اندازہ کسی قدر ان دونوں کتابوں کے مطالعہ سے ہوسکتا ہے۔

مہدی حسن نے کہا تھا کہ غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی اُردوئے خاصہ کی داد ملتی، لیکن شبلی کی اُردوئے خاصہ کی داد ایک غالب ہی سے کیوں چاہیئے،آج اگر انصاف سے دیکھا جائے تو مولانا شبلی کی اس خدمت کا جو انھوں نے اُردو کو حیات جاوید بخش کر کی ہے ہر شخص کو معترف ہونا چاہیئے،اس لیے کہ یہ قلم کا مسافر جس راہ سے بھی گزرا زبان و ادب کے لعل وگہر لٹاتا چلا گیا،بزم شعر وسخن میں قلم کی رنگینی اور طبیعت کی جولانی کا پیدا ہونا تو ممکن ہے کیونکہ شعرو

ادب کی محفل میں حسن تحریر اور لطف انشا کا ظہور آسان ہوتا ہے اس لیے کہ اس میں تخیلات کی حکمرانی اور مبالغہ کی فراوانی کی پوری گنجائش ہوتی ہے، لیکن تاریخی اور سوانحی واقعات کے بیان میں شوخی تحریر اور حسن ادا کو برقرار رکھنا شاخ آہو پر آشیانے کے خواب سے کم نہیں کیونکہ اس میں مقصود واقعہ کا اظہار ہوتا ہے۔

لیکن شبلی کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی سوانحی کتابوں میں بھی جہاں موضوع کی ندرت مواد کی کثرت، تحقیقات کی وسعت، روایت و درایت کی اہمیت اور دیانت دارانہ اور غیر جانبدارانہ عمل کی رعایت کی طرف پوری توجہ دیتے ہیں وہیں زبان و بیان کی حلاوت ولطافت اور الفاظ و تراکیب کی جدت و نزاکت کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور ہر گام پر زبان وادب کے ایسے بلند و بالا قلعے تعمیر کرتے چلے جاتے ہیں جس کی طرف نگاہِ التفات سے بھی دل کا بیٹھنا اور حوصلے پست ہو جاتے ہیں اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ اقلیم سخن کا شہنشاہ تاریخ و سوانح نگاری کی خشک و سنگلاخ وادی کو بھی زبان وادب کے بیش بہا خزانوں سے مالا مال اور لالہ زار کرنا چاہتا ہے اور اچھوتے پن، شائستگی، اظہار اور جوش بیان اس کے اشہب خامہ کی گرد راہ بنتے چلے گئے ہیں۔

اور اس صنف سخن میں اپنے مخصوص طرز تحریر کی بنا پر جو مقام حاصل کیا ہے اس نے ان کو ان کے تمام متقدمین و معاصرین میں منفرد اور ممتاز بنا دیا ہے، جس کا اعتراف نہ صرف یہ کہ ان لوگوں نے کیا جن پر مدلل مداحی کا الزام ہے بلکہ ان لوگوں نے بھی کیا ہے جو دیانتداری اور غیر جانبداری کے علمبردار ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے تحریر کیا ہے کہ فن سوانح نگاری میں ہمارے دوسرے ممتاز مصنف شبلی ہیں جو سوانح نگار ہونے کے ساتھ ایک بلند پایہ مؤرخ بھی ہیں ان کی نثر حالی کے مقابلہ میں زیادہ متنوع ہے اور سوانح نگاری میں ان کا رنگ حالی کے رنگ سے جدا ہے۔[۳۰]

اسی طرح ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور لکھتے ہیں کہ باوجود مولوی ہونے کے انھوں نے

مذہبی موضوعات کے لیے بھی دلکش اور پاکیزہ اسلوب بیان اختیار کیا، تاریخ تذکرہ سوانح اور تصوّف جیسے متضاد مباحث پر لکھتے وقت بھی انھوں نے ادبیت کا لحاظ رکھا ہے، اگرچہ اس التزام کے باعث بعض جگہ ان کی تحریریں کچھ مضحکہ خیز ہو گئی ہیں مگر حالیؔ اور ذکاء اللہ کی طرح گراں اور بوجھل نہیں ہونے پائیں۔[31]

لیکن جب کبھی بھی شاعر وادیب شبلیؔ، مؤرخ، سوانح نگار شبلی کے معاملات میں دخل اندازی شروع کر دیتا ہے اور شبلی شاعر کی شکل میں سامنے آجاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ اپنے شاعرانہ ذوق کی تسکین کے لیے کبھی فن تاریخ نویسی کو بالائے طاق رکھتے ہوں، جونہی مؤرخ وسوانح نگار شبلی کو احساس ہوتا ہے کہ شاعر یا انشا پرداز شبلی نے ان کا منصب چھیننا چاہا وہ چونک اٹھتے ہیں اور انھیں چونکتا دیکھ کر شاعر وانشا پرداز شبلی اپنی راہ لیتے ہیں۔[32] اور پھر وہی تحقیق وتفتیش کا شہسوار منزل سے قریب ہونے کے لیے تیز گام ہو جاتا ہے اور دیانت داری اور غیر جانبداری کی عنان اسے اپنے قابو میں رکھے رہتی ہے، اور بقول خواجہ حسن نظامی مبالغہ کی رنگینی سے ان کا قلم محفوظ رہتا ہے وہ سادہ نگاری میں بھی ایسی دبی ہوئی شوخیاں لکھ جاتے ہیں کہ انسان گھنٹوں مزے لیا کرے۔

موقع اور محل کے اعتبار سے الفاظ کا انتخاب جو بلاغت کی روح اور فصاحت کی جان ہے شبلی کا وصف خاص ہے، وہ اپنے مخصوص انداز بیان سے ایسا نقشہ کھینچتے ہیں گویا قاری کو تھوڑی دیر کے لیے اسی ماحول میں لے جا کر کھڑا کر دینے کے خواہاں ہوں مثلاً مامون الرشید عباسی کی سوانح لکھتے ہوئے قاری کو زبیدہ اور ہارون کے محلوں کی الف لیلوی فضاؤں میں لے جاتے ہیں تو ان کا قلم محل کے حسن ورعنائی اور دلکشی وزیبائی کو دیکھ کر بہکنے لگتا ہے، لکھتے ہیں ——— بزم عیش میں وہ رندانہ وضع سے بیٹھتا ہے، بے تکلف اور رنگین طبع احباب جمع ہیں، پری پیکر نازنینوں کا جھرمٹ ہے، دور شراب چل رہا ہے، گل اندام کنیزیں نغمہ سرا ہیں اور یاران باصفا بدمست ہوتے جاتے ہیں۔[33]

لیکن وہی قلم جب اپنے ہیرو مامون کی عقیدت سے سرشار ہو کر چلتا ہے تو اس کی

سبک خرامی بادِ صبا کی حریف بن جاتی ہے، اور لکھتا ہے ــــــ اسلام کو آج تیرہ سو برسوں سے کچھ اوپر ہوئے اس وسیع مدّت میں ایک تخت نشین بھی ایسا نہیں گزرا جو فضل و کمال کے اعتبار سے مامون کی شان یکتائی کا حریف ہو سکتا ہے، افسوس ہے کہ سلطنت کے انتساب نے اس کو خلفاء و سلاطین کے پہلو میں جگہ دی، ورنہ شاعری، ایام العرب، ادب، فقہ، فلسفہ کون سی بزم ہے جہاں فخر و شرف کے ساتھ اس کا استقبال نہ کیا جاتا[۳۴]

ایجاز جو بلاغت کی جان ہے جب اس کی کشور کشائی شبلی کے قلم سے وابستہ ہو جاتی ہے تو یہ تحریر وجود میں آتی ہے ــــ مامون کی نسبت مؤرخین کے متفقہ الفاظ یہ ہیں کہ تمام خلفائے بنی عباس میں کوئی تخت نشین دانائی، عزم، بردباری، علم، رائے، تدبیر، شجاعت، عالی حوصلگی اور فیاضی میں اس سے افضل نہیں گزرا، مامون کا ادعا کچھ بے جا نہیں کہ معاویہؓ کو عمرو بن العاصؓ کا بل تھا عبدالملک کو حجاج کا اور مجھ کو اپنا۔[۳۵]

لیکن یہی قلم جب مامون کے بستر مرگ کے قریب کھڑا ہو کر نزع کی کیفیت ضبط تحریر میں لاتا ہے تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ کیف و نشاط کا پروردہ غم و اندوہ کی آغوش میں کروٹیں لے رہا ہے، مثلاً اس نے نہایت حسرت سے آسمان کی طرف دیکھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے اسی حالت میں خدا نے اس کی زبان کھول دی وہ خدا کی طرف مخاطب ہوا اور کہا اے وہ جس کی سلطنت کبھی نہ زائل ہوگی اس پر رحم کر جس کی سلطنت زائل ہو رہی ہے، اسی پر اس کے نفس واپسیں نے الوداع کہا اور خدا کے سایۂ رحمت میں چلی گئی۔[۳۶]

لیکن وہی شبلی جب سیدنا عمر فاروقؓ کی حیات لکھنے بیٹھتے ہیں تو انداز یکسر بدل جاتا ہے اور حضرت عمرؓ کی عظمت و جلال کی جھلک ان کی تحریروں سے عیاں ہونے لگتی ہے اور دنیا بالکل بھول جاتی ہے کہ وہ سوانح نگاری پر کوئی تصنیف نہیں بلکہ عظمت و جلال کی داستان پڑھ رہی ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں ــــــ دنیا میں جس قدر حکمراں گزرے ہیں ہر ایک کی حکومت کی تہہ میں کوئی نہ کوئی مشہور مدبّر یا سپہ سالار مخفی تھا، یہاں تک کہ اگر اتفاق سے وہ مدبر یا سپہ سالار نہ رہا تو دفعۃً فتوحات بھی رک گئیں یا نظام حکومت کا ڈھانچہ بگڑ گیا، سکندر

ہر موقع پر ارسطو کی ہدایتوں کا سہارا لے کر چلتا تھا، اکبر کے پردے میں ابوالفضل اور ٹوڈر مل کام کرتے تھے، عباسیہ کی عظمت و شان برامکہ کے دم سے تھی لیکن حضرت عمرؓ کو صرف اپنے دست و بازو پر بل تھا۔[۳۷]

اسی طرح جب وہ کسی جنگ کا نقشہ کھینچتے ہیں تو میدان کارزار کا کروفر اور رعونت و سطوت کی حکمرانی ان کے قلم سے وابستہ ہو جاتی ہے مثلاً جنگ قادسیہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

سعد نے یہ دیکھ کر کہ ہاتھی جس طرف کا رُخ کرتے ہیں دَل کا دَل پھٹ جاتا ہے ضخم وسلم وغیرہ کو جو پارسی تھے اور مسلمان ہو گئے تھے بلا کر پوچھا کہ اس بلائے سیاہ کا کیا علاج ہے؟ انھوں نے کہا کہ ان کی سونڈ اور آنکھیں بیکار کر دی جائیں، تمام غول میں دو ہاتھی نہایت مہیب اور کوہ پیکر گویا کل ہاتھیوں کے سردار تھے ...... ادھر ربیل اور حمال نے اجرب پر حملہ کیا وہ زخم کھا کر بھاگا تو تمام ہاتھی اس کے پیچھے ہوئے اور دم کے دم میں سیاہ بادل چھٹ گیا، بہادروں کو حوصلہ افزائی کا موقع ملا اور اس زور کا رن پڑا کہ نعروں کی گونج سے زمین دہل دہل پڑتی تھی۔[۳۸]

اسی طرح سیرۃ النعمان کے طرز تحریر میں رعنائی و دلکشی کے بجائے غایت درجہ وقار و متانت نظر آنے لگتی ہے اور قلم کی آب و تاب مختلف سانچوں میں ڈھل کر الگ الگ روپ اختیار کر لیتی ہے اور امام کی زندگی کی مختلف شکلوں کی ترجمانی اس انداز میں کرنے لگتا ہے کہ قاری تھوڑی دیر کے لیے دوسری صدی ہجری کی علمی فضاؤں میں محو ہو جاتا ہے۔ مثلاً حلیہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ــــــ امام صاحب کو خدا نے حسن سیرت کے ساتھ جمال صورت بھی دیا تھا، میانہ قد، خوش رو اور موزوں اندام تھے۔[۳۹]

اسی طرح شبلی چاہتے تو وفات کے تذکرے میں دردناکی و سفاکی کی تصویر کھینچ کر رکھ سکتے تھے لیکن سراپا غم والم کی تصویر بن کر یوں رقم کرتے ہیں کہ ان کے مرنے کی خبر نہایت جلد تمام شہر میں پھیل گئی اور سارا بغداد امنڈ آیا حسن بن عمارہ نے کہ قاضی شہر تھے غسل دیا،

نہلاتے تھے اور کہتے جاتے تھے واللہ تم سب سے بڑے فقیہ بڑے عابد بڑے زاہد تھے تم میں تمام خوبیاں جمع تھیں تم نے اپنے جانشینوں کو مایوس کر دیا کہ وہ تمہارے مرتبہ کو پہونچیں۔۔۔ اور عبداللہ بن مبارک کی زبان میں" ابو حنیفہ خدا تم پر رحم کرے، ابراہیم مرے تو اپنا جانشین چھوڑ گئے، حماد مرے تو اپنا جانشین چھوڑ گئے۔ افسوس تم نے دنیا میں اپنا جانشین نہیں چھوڑا" [۵۹]

الغزالی اور سوانح مولانا روم میں بھی یہی لطافت بیان اور حسن عبارت کی جلوہ کاریاں ان کے قلم کی موجز بیانیاں اور فن وادب کی رنگارنگیاں قدم قدم پر بکھری پڑی ملتی ہیں، جس کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح شاعر قافیہ اور ردیف کی تکرار سے اپنے اشعار میں نغمگی اور آہنگ پیدا کر کے شعر کو خوش آہنگ بنا دیتا ہے اسی طرح شبلی نے الغزالی میں اپنے ہیرو کی امتیازی خصوصیات کا اعادہ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے کر کے اس میں حسن پیدا کر دیا ہے جس کے مطالعہ سے زبان سے بے ساختہ واہ نکل جاتی ہے۔

سوانح مولانا روم میں شبلی مولانا کے معاصرین اور ارباب صحبت کے تذکرے میں لکھتے ہیں ــــــ اسلام کو آج تیرہ سو برس ہوئے اور اس مدت میں اس نے بڑے بڑے صدمات اٹھائے لیکن ساتویں صدی میں جس زور کی اس کو ٹکر لگی کسی اور قوم اور مذہب کو لگی ہوتی تو پاش پاش ہو کر رہ جاتا، یہی زمانہ تھا جس میں تاتار کا سیلاب اٹھا اور دفعۃً اس سرے سے اس سرے تک پھیل گیا سیکڑوں ہزاروں شہر اجڑ گئے، کم از کم ۹۰ لاکھ آدمی قتل کر دیئے گئے سب سے بڑھ کر یہ کہ بغداد جو تاریخ اسلام کا تاج تھا اس طرح برباد ہوا کہ آج تک سنبھل نہ سکا [۶۰]

شمس تبریز کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ــــــ شمس کی ملاقات سے پہلے مولانا کے شاعرانہ جذبات اسی طرح ان کی طبیعت میں پنہاں تھے جس طرح پتھر میں آگ ہوتی ہے، شمس کی جدائی گویا چقماق تھی اور شرارے ان کی پرجوش غزلیں [۶۱]

اس کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے اختر وقار عظیم نے لکھا ہے کہ شبلی نے اپنی دوسری تصانیف کی طرح کتاب کی خشکی اور بے کیفی دور کرنے کے لیے سوانح مولانا روم میں بھی جا بجا

دلچسپ قصّے بیان کیے ہیں اور مولانا روم کی عظمت کی داستانیں بھی اِدھر اُدھر بکھری ہیں...
بلاشبہ ادبیت کے لحاظ سے سوانح مولانا روم ایک بلند پایہ کتاب ہے[۴۳]

غرض زبان وادب کی نہر سلسبیل شبلی کی تمام سوانحی کتابوں میں اسی طرح بیماں اور غلطاں نظر آتی ہے جس کو پڑھ کر دلوں کو سرور اور آنکھوں کو نور ملتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کاروان علم وادب کا کوئی مسافر قافلہ سے بچھڑ کر دور سنسان و ویران صحرا میں اپنی مخصوص حدی خوانی کے ذریعہ ایک نئے قافلہ کی تشکیل کرنا چاہتا ہے، ایسا قافلہ جو (۱) غیر معمولی انسانوں کی تاریخ رکارڈ کرے (۲) جس کو اس بات کا احساس ہو کہ وہ ایک آرٹ کی تخلیق کر رہا ہے (۳) جو انسانوں کی موت وحیات کے سنین ہی نہیں بلکہ اس کے پورے عہد اور ماحول کو سمیٹے ہوئے ہو (۴) جو اپنے ہیرو کو اس طور پر پیش کرے کہ قاری کی توجہ اس کے کردار اور ذات پر مرکوز ہو کر رہ جائے (۵) جو اپنے انداز بیان، محاورے اور استعاروں کے ذریعہ سوانح نگاری میں زندگی پیدا کر دے ایسی زندگی جو سوانح نگاری کے لیے حسن بیکراں بن جائے کہ یہی وہ خصائص ہیں جو شبلی کی سوانح نگاری میں مجسم اور متحرک نظر آتے ہیں اور وہ اپنے جدید کاروان علم وفن میں اسی کو پیدا کرنے اور پروان چڑھانے کے خواہاں بھی تھے۔

نیا ہے لیجیے جب ذکر اس کا
عجب وسعت ہے شبلی کے بیاں میں

حواشی

۱۔ Oxford Doctianry
Oxford Uneverecity V1 P87.

۲۔ المامون ص ۹۶

۳۔ حیات شبلی ص ۲۶۰

۴۔ ایضاً ص ۳۷۷

۵۔ Heroes Ship and hiroisin history P. 72

۶۔ مطالعہ سلیمانی ص ۹۳

۷۔ اردو ادب میں سوانح نگاری کا ارتقاء ص ۱۵۳

۸۔ سرسید اور ان کے نامور رفقاء ص ۱۸۰

؎۹ مقالات شبلی جلد چہارم ص۵
؎۱۰ اردو ادب میں سوانح نگاری کا ارتقاء ص۳۰
؎۱۱ المامون ص۴۵
؎۱۲ ایضاً ص۴۳
؎۱۳ ایضاً ص۲۴
؎۱۴ ایضاً ص۱۲۸
؎۱۵ سیرۃ النعمان ص۱۷
؎۱۶ ایضاً ص۲۷۶
؎۱۷ الفاروق ص۴۲
؎۱۸ الغزالی ص۲۱۳
؎۱۹ سرسید اور ان کے نامور رفقاء ص۱۹۳
؎۲۰ ایضاً ص۱۹۳
؎۲۱ الفاروق ص۵۷
؎۲۲ المامون ص۴
؎۲۳ حیات شبلی ص۶۹
؎۲۴ ایضاً ص۱۸۰
؎۲۵ صبا حیدرآباد شبلی نمبر ۱۹۵۸ء
؎۲۶ سرسید اور انکے نامور رفقاء ص۱۶۸
؎۲۷ شبلی بحیثیت مؤرخ ص۱۱۷
؎۲۸ مولانا شبلی اردو کے بہترین انشاپرداز
؎۲۹ اردو ادب میں سوانح نگاری کا ارتقاء ص۱۳۰
؎۳۰ سرسید اور ان کے نامور رفقاء ص۱۵۵
؎۳۱ صبا حیدرآباد شبلی نمبر
؎۳۲ شبلی بحیثیت مؤرخ
؎۳۳ المامون ص۱۵۸
؎۳۴ ایضاً ص۱۷۵
؎۳۵ 〃 ص۱۵۴
؎۳۶ 〃 ص۱۲۵
؎۳۷ الفاروق ص۲۴۷
؎۳۸ ایضاً ص۹
؎۳۹ سیرۃ النعمان ص۴۰
؎۴۰ ایضاً ص۳۷
؎۴۱ سوانح مولانا روم ص۳۰
؎۴۲ ایضاً ص۱۸
؎۴۳ شبلی بحیثیت مؤرخ ص۱۱۷

ڈاکٹر شمس تبریز خاں
شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی

اکبر الٰہ آبادی کا مقام و مرتبہ

اکبر الٰہ آبادی مشرق اور ہندوستان کے وہ وفادار سپوت تھے جو مرتے دم تک مشرق اور اپنے وطن سے وفاداری کا دم بھرتا رہا اور اس کی عظمت و محبّت کے گیت گاتا رہا، مشرقی ادبیات میں شاید ہی کوئی ادیب و شاعر ان سے بڑھ کر مشرق دوست اور مشرق پسند گزرا ہو، ان کی مشرق پسندی کسی تنگ نظری و تنگ ظرفی پر مبنی نہیں بلکہ اس میں بڑی وسعت اور بڑی گہرائی ہے۔ ان کے تصوّرِ مشرق میں مذہب بھی ہے، تہذیب بھی، زبان بھی ہے اور آداب واخلاق بھی، مشرق سے ان کی محبّت عصبیت تک اور اس کی حمایت حمیّت تک بڑھی ہوئی ہے، مشرق سے یہ جذباتی لگاؤ اور قلبی تعلّق اکبر کی بڑائی بھی ہے اور کمزوری بھی۔ مشرقی تہذیب کی وضعداری مشہور ہے جس کا ایک اعلیٰ نمونہ اکبر بھی ہیں جو مغربی تعلیم و تہذیب سے بہت قریب اور انگریزی حکومت کے حاکم و محکوم ہوتے ہوئے بھی اپنی وضع پر قائم رہے اور مشرقی تہذیب کی برتری کا علم بلند کیے رہے۔ اکبر کے معاصرین میں بھی شاید ہی کوئی ایسا فن کار ہو جس کا مشرق سے ایسا مثالی تعلق ہو اور جس میں وفاداری و استواری کی یہ شان ہو، اپنے نصب العین سے ایسا تعلّق اور وابستگی چاہے زندگی میں ہو یا فن میں بہرحال قابل تعریف ٹھہرتی ہے۔ مشرق سے اکبر کی یہ وابستگی نفسیاتی ردعمل بھی ہوسکتی ہے کہ انھوں نے سلطنت مغلیہ کا خاتمہ اور ۱۸۵۷ء کا خونیں انقلاب اور پھر انگریزی سامراج کا قیام اور مشرقی حکومت و تہذیب کے ملبے پر مغربی اقتدار و استعمار کا استحکام اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اس کا صدمہ انھیں برداشت کرنا پڑا تھا، ان کی حساس طبیعت اور ان کی فطری ذہانت انگریزی اقتدار کے ظاہری اثرات کے ساتھ اس کے دور رس معنوی و باطنی نتائج بھی دیکھ

رہی تھی جس نے مشرق کے مذہب وتہذیب، حکومت واقتدار، اور افکار واقدار سب کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور مشرق کی پوری زندگی کو خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ اکبر نے ایک باشعور وصاحب ضمیر فن کار کی طرح مستقبل کے سارے خطرات وخدشات بھانپ لیے تھے اس لیے لازمی وفطری طور پر انھوں نے اپنے موقف کا تعین کرلیا اور اس کے لیے اپنی ساری فن کارانہ صلاحیتیں وقف کردیں۔

اکبر کی عظمت کو سمجھنے کے لیے مذہب کی حقیقی روح سے واقفیت، مشرقی تہذیب کے محاسن کا شعور، اور مغربی تہذیب کی کمزوریوں کا علم ضروری ہے، اکبر کی اہمیت ان کے احساس وشعور کی تیزی، نظر کی گہرائی اور مشاہدہ کی گیرائی، بیدار مغزی وروشن ضمیری، اپنے زمانہ کی ہمہ جہت تبدیلیوں کا احساس اور حالات وحوادث پر ردعمل اور روح عصر سے واقفیت اور اس کی ترجمانی میں مضمر ہے، ان کے معاصرین میں داغ وامیر کے یہاں تو کسی تبدیلی کا پتہ ہی نہیں چلتا البتہ حالی وشبلی اور شاد کے یہاں نئے حالات کی آہٹ محسوس ہوتی ہے لیکن اکبر نے جس طرح حالات کی ایک ایک کروٹ پر نظر رکھی اور نئی تبدیلیوں کے بارے میں جس شدت اور فن کارانہ مہارت کے ساتھ اپنے ردعمل کا اظہار کیا اس سے ان کی عظمت وانفرادیت کا تعین ہوتا ہے۔

مغربی تہذیب میں انسانی عناصر کی کمی اور روحانیت کے فقدان، خارجیت اور ظاہر پسندی، مادیت ومیکانکیت کا غلبہ، عیش کوشی اور لذت طلبی کی ہوس، استحصال واستبداد، سامراجیت اور استعماریت کے ذہن ومزاج کو اکبر نے اچھی طرح محسوس کرلیا تھا اور اس کی کمزوریوں کو سمجھ لیا تھا اس لیے اس کے خلاف انھوں نے مخالفانہ ردعمل کا اظہار کیا اور پوری قوت سے صدائے احتجاج بلند کی اگرچہ طنز وظرافت ان کے لہجے کو معتدل بنادیتے ہیں۔ اور مزاحیہ انداز ان کی تنقید کی تلخی کو چاشنی میں بدل دیتا ہے۔ ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ ایک ہنسی شدت غم کا بھی نتیجہ ہوتی ہے۔ اس لیے اکبر کا طنز ومزاح بھی ان کے روحانی کرب اور درد دل کی بدلی ہوئی شکل ہے جس میں ان کی آہوں اور کراہوں، سسکیوں اور ہچکیوں کی غم انگیز آوازیں سنی جاسکتی ہیں، اور ان کے ہنستے ہوئے چہرے کے ساتھ ان کی روتی ہوئی آنکھوں کو بھی دیکھا جاسکتا ہے، اکبر کی ہنسی دراصل زہر خند بلکہ خندۂ تیغ اصیل ہے۔

اکبر نے مزاح کا پیرایہ بڑے مصالح کے تحت اختیار کیا تھا، اس کے علاوہ لکھنؤ میں اودھ پنچ کے اثر سے طنز ومزاح کا ادبی ماحول بنا ہوا تھا اور ویسے بھی طنز کی کڑوی گولی کو مزاح کی چاشنی

گوارا بنا دیتی ہے اور مزاح نگار اپنے کو صاف گوئی سے بچاتے ہوئے ہر موضوع میں دخل درمعقولات کرسکتا ہے اور راست بیانی کی تلخی کو مزاح کی شیرینی میں بدل سکتا ہے۔

اکبر نے مزاح Humour طنز Satire اور ظرافت Wit سب سے کام لیا ہے، مگر ان کی ہنسی وقتی تفریح اور محض ہنسنے ہنسانے کے لیے نہیں ہے بلکہ اس میں ایک مٹتی تہذیب کا کرب و الم ایک بدلتے سماج کا غم، ایک اجنبی تہذیب کے غلبے کے خلاف احتجاج، ملک وملت کا درد، مشرق کی عظمت، مذہب کی عزّت اور انسانی اقدار کی حرمت کا پیغام موجود ہے۔ اکبر اپنے طرز کے طنز ومزاح کے موجد ہیں، اقبالؔ نے مغربی تہذیب کے خلاف ان کے موقف کے ساتھ ان کی مزاح نگاری کی بھی تقلید کی اور اب تک جو با مقصد مزاحیہ شاعری ہورہی ہے اس کے امام اعظم اکبر ہی کہے جاسکتے ہیں۔

مگر اکبر کو نرا مزاح نگار سمجھنا بڑی غلطی ہے وہ اچھے سنجیدہ غزل گو بھی ہیں اور روایتی تغزل میں اپنے معاصرین سے کسی طرح پیچھے نہیں، ان کا کلیات خاصا ضخیم ہے جس میں سنجیدہ غزلوں کا تناسب آدھے سے کم نہیں وہ تغزل کے تمام آداب سے واقف ہیں اور روایتی غزل کی پختگی اور شگفتگی اس میں موجود ہے، وہ اچھے رباعی گو اور قطعہ نگار بھی ہیں، ان کی بعض نظمیں جدید اردو نظم کا نقطۂ آغاز کہی جاسکتی ہیں زبان وبیان پر غیر معمولی قدرت میں وہ اپنے معاصرین میں بھی ممتاز ہیں، انھوں نے بڑے مشکل قافیے باندھے ہیں مگر ان کا قافیہ کہیں تنگ نہیں ہوا ہے، انھوں نے انگریزی کے بے شمار الفاظ اردو میں مروّج کیے ہیں اور زبان کو وسعت دی ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بہت صحیح کہا تھا کہ "اردو نے تین کامل الفن استاد پیدا کیے یعنی سوداؔ، اکبر اور حسرتؔ۔

اکبر کی غزل اپنی لسانی ومعنوی خوبیوں کے لیے ممتاز ہے اور اس پر ان کی انفرادی چھاپ لگی ہوئی ہے، روایتی مضامین کے ساتھ اختراعی اور نئے مضامین بھی کم نہیں بلکہ مضامین کی گوناگونی ورنگارنگی، ان کی قوّت ایجاد واجتہاد، ذہنی زرخیزی، تخیل کی بلند پروازی، احساس وشعور کی تیزی اور بے خطا ذہانت وفطانت کی روشن دلیل ہے وہ اس خاص سیاق میں انشاء اللہ خاں انشاءؔ سے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے مضامین میں بلندی سے زیادہ تنوع و طرفگی، تازہ

خیالی اور تازہ کاری ہے، ۱۹ ویں صدی کے نصف آخر سے بیسویں صدی کے آغاز تک کے بیشتر مسائل ان کے موضوعات میں شامل ہیں، انگریزی حکومت، تحریک آزادی، علی گڑھ تحریک، ہندو مسلم اتحاد، ہندی اردو، کانگرس، مسلم لیگ، خلافت تحریک، دہلی دربار، گاندھی جی اور علی برادران، ندوہ اور دیو بند سب پر انھوں نے اظہار خیال کیا ہے۔

روشن خیالی و روشن ضمیری پر مبنی مذہبیت اور توحید و خدا پرستی اکبر کا ایک نمایاں فکری رجحان ہے جو ان کی نظم و غزل میں نمایاں ہے، مذہب کی حقیقی روح یعنی خدا سے مخلصانہ تعلق اور خلق خدا سے بے غرض محبت پر زور ان کے کلام میں ابدیت کی شان پیدا کر دیتا ہے، خدا کے وجود کے دلائل انھوں نے طرح طرح سے دیئے ہیں جو بہت فکر انگیز اور اطمینان بخش ہیں، مشرق و مغرب کے بہت سے مفکّرین کی طرح اکبر کا بھی یہ کہنا ہے کہ ایمان و اطمینان قلب، منطق و فلسفہ سے نہیں بلکہ وجدان و تجربہ، مشاہدہ اور غور و فکر، تلاش حق کے جذبۂ صادق اور دروں بینی سے حاصل ہوتا ہے[۵]

ذہن میں جو گھر گیا لا انتہا کیوں کر ہوا | جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیوں کر ہوا
فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں | ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں
مری ہستی ہے خود شاہد وجود ذات باری کی | دلیل ایسی ہے یہ جو عمر بھر رد ہو نہیں سکتی
تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا | بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے
صدیوں فلاسفی کی چناں اور چنیں رہی | لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

مغربی تہذیب کی طرح اکبر سائنس سے بھی مرعوب نہیں ہوئے اور سائنسی افواہوں پر یقین نہیں کیا اس سلسلے میں ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کی انھوں نے سختی سے تردید کی جو نا پختہ دماغوں اور سائنس سے مرعوب شدہ ذہنوں کو الحاد کی طرف لے جاتا ہے، مزے کی بات یہ ہے کہ اکبر کے کچھ ہی عرصے بعد خود بعض سائنسدانوں نے نظریۂ ارتقاء کی خامیوں کو اجاگر کر دیا۔ اکبر نے انسانی ضمیر سے اپیل کی اسے ایک نبی اور شریف انسان حضرت آدمؑ کی اولاد ہونا گوارا ہے یا بندر زادہ ہونا؟

ڈارون صاحب حقیقت سے بہت ہی دور تھے | میں نہ مانوں گا کہ آباء آپ کے لنگور تھے
بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو | بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے جناب ڈارون کو حضرتِ آدم سے کیا مطلب

تہذیب کے سلسلے میں وہ مشرقی تہذیب کے دلدادہ ہیں جسے افرا و ایشیائی تہذیب بھی کہہ سکتے ہیں جس کی بنا استحصال کے بجائے ایثار و قربانی، نفع اندوزی کی جگہ نفع رسانی، مطلب پرستی کی جگہ وضعداری و وفاداری، اور ظاہر داری کے بجائے خلوص پر تھی، جس میں مادی منافع اور صارفیت کی جگہ انسانیت کو اہمیت دی گئی تھی اور اسے مرکزیت حاصل تھی، جس میں انسانی رشتوں اور احترام آدمیت کو اوّلیت دی گئی تھی، اس میں پاس ادب تھا، حفظ مراتب تھا، چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کی عزّت تھی، جس میں کمزور طبقات اور صنف نازک کی رعایت تھی، جس میں مروت و شرافت اور آپسی محبّت تھی۔

مغربی تہذیب میں ان میں سے اکثر اقدار کی نفی ہوتی ہے۔ اس لیے اکبر نے کھل کر اس کی مخالفت کی اور اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اس سلسلے میں اکبر کا یہ امتیاز ہے کہ وہ مغربی تہذیب کے غلبے اور مغربی سامراج کی فتح کے یقین کے باوجود نہ اس سے ذہنی طور پر مرعوب ہوئے اور نہ ہار مانی، یہ انسانی عزم و قوّتِ ارادی، قوّتِ فیصلہ، اور ثبات و استقامت کی نایاب مثال ہے جس سے وہ مثالی اور مضبوط کردار بنتا ہے جس کی مشرق کو ضرورت ہے، مغربی تہذیب کے مقابل اکبر کے تنقیدی موقف سے علّامہ اقبال کے موقف کو بھی تقویت و طاقت حاصل ہوئی اور انھوں نے اس کو مزید شدّت اور فکر و بصیرت کے ساتھ اپنایا ؎

مرزا غزیب چپ ہیں ان کی کتاب ردّی بدھو اکڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

اکبر ہمارے عہد کا اللہ رے انقلاب گویا وہ آسماں نہیں وہ زمیں نہیں

یہ موجودہ طریقے راہیٔ ملکِ عدم ہوں گے نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے

مرید دیر ہوئے وضع مغربی کرلی　　نئے جنم کی تمنا میں خودکشی کرلی

نظم اکبر کو سمجھ لو یادگار انقلاب　　یہ اسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی

جس روشنی میں لوٹ ہی کی آپ کو سوجھی　　تہذیب کی ہیں اس کو تجلی نہ کہوں گا

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا　　کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جاکر

کیا کہوں اس کو میں بدبختی نیشن کے سوا　　اس کو آتا نہیں اب کچھ امی ٹیشن کے سوا

اکبر نئی تعلیم کے خلاف نہیں لیکن مغرب نے جس طرح اسے مغربی تہذیب کا آلۂ کار بنایا اور اس کے ذریعے مشرق کی قلب ماہیت کی، اور مشرقی اقدار، اور سیرت و کردار میں تبدیلی کا ذریعہ بنایا اور مشرق کو اپنی ذہنی غلامی کے لیے تیار کیا وہ ان کے لیے قابل اعتراض ہے وہ اسے کردارکشی قرار دیتے ہیں، مغربی نظام تعلیم پر اکبر کی تنقید نہایت بصیرت افروز اور بامعنی اور ان کی فراست کا نمونہ ہے ؂

یوں قتل سے بچوں کے نہ ہوتا بدنام　　افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں　　مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے　　دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

قابلیت تو بہت بڑھ گئی ماشاء اللہ　　مگر افسوس یہی ہے کہ مسلماں نہ رہے

ہم ایسی سب کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں   کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر   خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

ہماری قومی زندگی میں وہ سرسید احمد خاں مرحوم کے تعلیمی کارناموں اور علی گڑھ تحریک سے بہت متاثر تھے وہ سرسید کی انگریز دوستی سے تو خوش نہ تھے لیکن ان کی قومی ہمدردی اور مسلمانوں کی تعلیم وترقی کے لیے مخلصانہ جدوجہد کے بہت قائل تھے، کہتے ہیں ؎

واہ اے سید پاکیزہ گہر کیا کہنا   یہ دماغ اور حکیمانہ نظر کیا کہنا

قوم کے عشق میں یہ سوز جگر کیا کہنا   ایک ہی دھن میں ہوئی عمر بسر کیا کہنا

اسی طرح گاندھی جی کی تحریک آزادی سے بھی وہ بہت متاثر اور اس کے قدرداں تھے حتیٰ کہ ایک کتابچہ "گاندھی نامہ" مرتب کردیا اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

انقلاب آیا، نئی دنیا نیا ہنگامہ ہے   شاہنامہ ہو چکا اب وقت گاندھی نامہ ہے

مدخولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا   اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

تحریک سودیشی پہ مجھے وجد ہے اکبر   کیا خوب یہ نغمہ ہے چھڑا دیس کی دھن میں

بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں   اک مشت خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

اکبر ہندوستان کی مشترکہ گنگا جمنی تہذیب اور ہندومسلم اتحاد کے دل سے قائل ہیں اور اسے قائم رکھنے کی تلقین کرتے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنے مذہب کی خوبیوں کو اپنانے اور انسانیت کا نمونہ بننے کی تعلیم دیتے ہیں ؎

کہتا ہوں میں ہندو و مسلماں سے یہی   اپنی اپنی جگہ پہ تم نیک رہو

لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ   موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

ہندو و مسلم ایک ہیں دونوں   یعنی یہ دونوں ایشیائی ہیں

ہم وطن، ہم زباں و ہم قسمت   کیوں نہ کہدوں کہ بھائی بھائی ہیں

آخر میں اس "اکبر نامہ" کا خاتمہ بالخیر اکبر کے اس قطعہ سے مناسب معلوم ہوتا ہے جو عصر حاضر کے نام اکبر کا پیغام کہا جا سکتا ہے ؎

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ میں جھولو
پر ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو!

ظفر احمد صدیقی

ہمتِ دشوار پسند

عبدالرحمٰن بن علی معروف بہ ابن الجوزی (۵۰۸ھ۔ ۵۹۷ھ) مشاہیر علمائے اسلام میں ہیں۔ حدیث و تاریخ میں انھیں امامت کا درجہ حاصل تھا۔ تفسیر، حدیث، تاریخ، اخلاقیات، مواعظ اور دیگر مختلف علوم و فنون میں تین سو سے زائد کتابیں ان سے یادگار ہیں۔ ابن الجوزی کا ادبی پایہ بھی بلند ہے۔ ان کی تحریریں ادبی حسن و جمال سے معمور ہوتی ہیں۔

"صید الخاطر" ابن الجوزی کی سوانحی و تاثراتی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ اس کا ایک اقتباس حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی نے اپنی مشہور تالیف "مختارات" میں شامل فرمایا ہے۔ جو عربی نثر کی نمایندہ نگارشات کا گراں قدر انتخاب ہے۔ صید الخاطر کا یہ اقتباس ۱۹۷۳ء میں راقم نے اسی کتاب میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں پڑھا تھا۔ اس کی ادبیت اور اثر آفرینی نے اسی وقت سے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ میری خواہش تھی کہ کبھی موقع ملے تو اسے اردو میں منتقل کردوں، لیکن بقول یگانہ ؎

اسی فریب نے مارا کہ کل ہے کتنی دور
اس آج کل میں عبث دن گنوائے کیا کیا

پیش نظر ترجمہ اسی دیرینہ آرزو کی تکمیل ہے۔ اس بات کی شعوری کوشش کی گئی ہے کہ اسے ترجمانی کے بجائے ترجمے سے قریب تر رکھا جائے۔ مترجم

کسی انسان کے لیے سب سے بڑی آزمائش، اس کی اولوالعزمیاں ہوتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ اولوالعزم لامحالہ بلندیوں کا طالب ہوتا ہے۔ پھر بسا اوقات زمانہ ناساز گار اور وسائل معدوم ہوتے ہیں

ایسی صورت میں اس شخص کی زندگی اس کے لیے عذاب بن جاتی ہے۔

مجھے بھی ہمتِ بلند سے کسی قدر نوازا گیا ہے، چنانچہ میں بھی اس کے ہاتھوں یک گونہ مبتلائے عذاب ہوں۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ کاش یہ ہمت بلند نہ ہوتی، کیونکہ عقل جس قدر کم ہو زندگی کی حلاوت اسی قدر بڑھ جاتی ہے اور صاحب عقل لطف و لذت کی زیادتی کا سودا عقل کی کمی سے نہیں کرسکتا۔

میں نے بعض شخصیات کا مطالعہ کیا جو اپنی اولوالعزمی کا تذکرہ بڑے زور وشور سے کرتی ہیں لیکن غور و تامل کے بعد یہ حقیقت سامنے آئی کہ ان کی ساری بلند پروازی صرف ایک جہت میں ہے۔ پھر یہ کہ انھیں ان جہتوں میں اپنے نقص کی پرواہ بھی نہیں، جو کہیں زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ مثلاً شریف رضی کہتا ہے:۔

وبکل جسم فی النحول بلیۃ ۔۔۔۔۔ وبلاء جسمی من تفاوت ھمتی

(جب کوئی بدن نحیف و ناتواں ہو، تو سمجھ جاؤ کہ اس کے پس پشت کسی مصیبت کا عمل دخل ہے۔ میرے تن ناتواں کی بلا و آفت، میری حد سے بڑھی ہوئی اولوالعزمی ہے)

میں نے غور کیا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ اس شخص کا منتہائے شوق امارت و خلافت ہے۔

ابومسلم خراسانیؒ عنفوان شباب میں سوتا بہت کم تھا اس سے پوچھا گیا کہ اس کا سبب کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ شفاف ذہن ہے، بلند عزائم ہیں اور ایک روح ہے جو بلندیوں تک پہنچنے کیلئے بے تاب و بے قرار ہے، لیکن افسوس کہ زندگی بے وقوفوں اور پست لوگوں کی طرح بسر ہو رہی ہے۔ سوال کیا گیا کہ تمھاری تشنگی کا علاج کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ حصولِ سلطنت، کہا گیا تو اسے حاصل کرو۔ اس نے کہا اس راہ میں خطرات بہت ہیں۔ کہا گیا تو خطرات میں کود پڑو۔ اس نے کہا عقل روکتی ہے۔ پوچھا گیا پھر حل کیا ہے؟ اس نے جواب دیا میں اپنی دانائی کے ایک حصے کو نادانی میں تبدیل کردوں گا اور پھر ان خطرات میں کود پڑوں گا، جن کی طرف اقدام نادانی کے بغیر ممکن نہیں۔ دوسری طرف اپنی دانائی سے تحفظ کی وہ تدبیریں اختیار کروں گا، جن کا حصول صرف دانائی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ یہ سب اس لیے کہ میرے نزدیک گم نامی اور موت ہم معنی ہیں۔

میں نے اس بے چارے کی حالت کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ سب سے اہم چیز یعنی جانب آخرت

کو اس نے ضائع کر دیا اور جہاں بانی و سلطنت کی راہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ چنانچہ بے پناہ کشت وخون کے بعد کسی درجے میں اس کی مراد اسے حاصل ہوگئی یعنی دنیا کی لذتیں۔ لیکن اس کی عیش سامانیوں کا یہ دور آٹھ برس سے متجاوز نہ ہوسکا، چنانچہ دھوکے سے قتل کر دیا گیا۔ عقل کی تدبیریں دھری رہ گئیں جان سے ہاتھ دھونا پڑا اور آخرت کی طرف اس کی روانگی برے حال احوال میں ہوئی۔

متنبی کہا کرتا تھا :-

وفی الناس من یرضی بمیسور عیشہ ومرکوبہ رجلاہ والثوب جلدہ

ولکن قلبا بین جنبیّ ما لہ مدیً ینتھی بی فی مراد احدہ

تری جسمہ یکسی شفوفا تربہ فیختار ان یکسی دروعا تھدہ

(بعض لوگ گئی گذری زندگی پر بھی قناعت کر بیٹھتے ہیں یعنی ان کی ٹانگیں ہی ان کی سواری ہوتی ہیں اور ان کی کھال ہی ان کا لباس۔ لیکن میرے پہلو میں ایک ایسا دل ہے کہ میں اس کی امنگوں اور آرزوؤں کی حد قائم کرنے میں ہنوز ناکام ہوں۔ یہ دل جب اپنے جسم کو نرم و نازک ملبوسات میں دیکھتا ہے، تو مطالبہ کرتا ہے کہ اسے وہ زرہیں اور جنگی لباس پہناؤ جن کا بوجھ اسے چور چور کر دے۔)

میں نے اس شخص کے بارے میں بھی غور کیا تو یہ بات سامنے آئی کہ اس کی تمام آرزوؤں کا ماحصل بھی دنیا اور صرف دنیا ہے۔

ان سب کے بعد جب میں اپنی اولوالعزمی و بلند حوصلگی پر نظر کرتا ہوں، تو اس کے احوال عجیب دکھائی دیتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ میں ایسا علم حاصل کرنا چاہتا ہوں، جس کے بارے میں یقین ہے کہ میری رسائی وہاں تک کبھی نہیں ہوسکتی، اس لیے کہ میری تمنا ہے کہ میں تمام علوم و فنون اور ان کی تمام شاخوں میں درجۂ کمال تک پہنچ جاؤں۔ ظاہر ہے کہ اس آرزو کے ایک حصے کی تکمیل کے لیے بھی پوری عمر ناکافی ہے۔ دراصل میرے نزدیک وہ عزم و حوصلہ ناقص ہے جو ایک فن میں درجۂ کمال کو پہنچ جائے، لیکن دوسرے میں ناقص ہو۔ مثلاً وہ محدث جو فقہ سے بیگانہ ہو، یا وہ فقیہ جو حدیث سے ناآشنا ہو۔ بہر حال میں تو علم کے باب میں کمی و کوتاہی کو پست ہمتی کا ہی ثمرہ تصور کرتا ہوں۔ پھر یہ بھی ہے کہ میں علم کو عمل کی انتہاؤں تک رسائی کا ذریعہ بنانا چاہتا ہوں۔ چنانچہ میری آرزو ہے کہ میں بشر حافیؒ جیسا متقی و پرہیزگار

اور معروف کرخی جیسا زاہد شب زندہ دار بن جاؤں ۔ حالانکہ مطالعۂ کتب، افادۂ خلق اور سماج میں زندگی بسر کرتے ہوئے مطلوبہ زہد و اتقاء کا حصول نہایت دشوار ہے۔

اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ مجھے عامۃ الناس کا دست نگر نہ ہونا پڑے، بلکہ میں خود ان کے ساتھ داد و دہش کا معاملہ کرتا رہوں۔ اب مشکل یہ ہے کہ علمی مشاغل کسبِ معاش کی راہ میں رکاوٹ نظر آتے ہیں، دوسری طرف ہمت عالی کسی کا ممنونِ کرم ہونے کی اجازت بھی نہیں دیتی ۔ پھر جس طرح مجھے تصنیف و تالیف کا شوق ہے، اسی طرح فرزند و زن کی بھی خواہش ہے، تاکہ میرے بعد یہ دونوں میرے روحانی، جسمانی نائب بن سکیں۔ لیکن یہ دونوں ہی چیزیں میرے خلوت پسند دل کے لیے رکاوٹوں اور الجھنوں کا باعث بھی ہیں۔ پھر میں عمدہ اور پسندیدہ چیزوں سے لطف اندوز ہونے کا خواہاں بھی رہتا ہوں، لیکن ان کے حصول میں بھی مال کی کمی حائل بن جاتی ہے۔ پھر اگر یہ مقصود حاصل بھی ہو جائے تو اولوالعزمی کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ مجھے اپنے جسم کے لیے اچھے ماکولات و مشروبات کی بھی خواہش رہتی ہے۔ کیونکہ وہ نازو نعمت اور لطف و لذت کا خوگر ہے۔ لیکن یہاں بھی مال کی کمی آڑے آتی ہے ۔ الحاصل یہ تمام باتیں اضداد کو جمع کرنے کی قبیل سے ہیں۔ اب میرے کوالف کا ان لوگوں کے احوال سے کیا مقابلہ ؟ جن کی اولوالعزمی کی معراج دنیا طلبی ہے ۔ مجھے یہ بات بھی ہرگز پسند نہیں کہ دنیا کا حصول، میرے دین کے چہرے کو کسی طرح بھی خراش آلود کرے یا میرے علم اور عمل پر اثر انداز ہو ۔

افسوس افسوس کہ علمی مذاکرات، تصنیف و تالیف میں دل کی مشغولی اور جسم کے لیے مناسب حال غذا کی فراہمی کے ساتھ ساتھ میں شب زندہ داری اور طہارت و تقویٰ کو خاطر خواہ طور پر جمع نہیں کر پاتا۔ ہائے ہائے ! کہ لوگوں کی ملاقاتوں اور تدریسی مشغولیات کے سبب خلوت کی مناجاتیں رہی جاتی ہیں۔ آہ آہ ! کہ فرزند و زن کے لیے کسبِ معاش کے نتیجے میں زہد و اتقاء کا چشمۂ صافی گدلا ہوا جاتا ہے۔

اب میں نے بھی اس عذاب کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ شاید کہ یہی کاہشیں اور کلفتیں میری تہذیب نفس کا ذریعہ بن جائیں ۔ اس لیے کہ اولوالعزمی قربِ الٰہی تک پہنچانے والے امور

کی خواہاں ہے اور راہ طلب میں نکل پڑنا ہی بسا اوقات مقصود تک رسائی، کا ذریعہ بن جاتا ہے پھر میں تو ایک ایک سانس کی حفاظت کرتا ہوں کہ وہ بے فائدہ ضائع نہ ہو جائے۔ اگر میرے عزائم اپنی مراد تک جا پہنچتے ہیں تو بہت خوب، ورنہ مومن کی نیت اس کے عمل سے بالاتر ہے۔

حواشی

۱۔ شریف رضی (۳۵۹ھ - ۴۰۶ھ) بنو طالب کے کثیر التعداد نغز گو شعرا کے درمیان سب سے بڑا شاعر۔ بغداد میں پیدا ہوا وہیں وفات پائی۔ "نقابتِ اشراف" کے منصب پر فائز ہوا۔ بندش کی چستی اور بیان کی دل آویزی کے لحاظ سے صفِ اوّل کا شاعر تھا۔ دیوان کے علاوہ بعض کتابیں بھی یادگار چھوڑیں۔ اس کی شہرت و ناموری میں "نہج البلاغہ" کی ترتیب و تدوین کا بھی بڑا حصہ ہے۔

۲۔ ابو مسلم خراسانی (۱۰۰ھ - ۱۳۷ھ) بانی خلافتِ عباسیہ۔ نامور قائد۔ سفاح عباسی کے نام کا خطبہ پڑھا۔ پھر ایک لشکر جرار تیار کر کے آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد کو شکست دی۔ سفاح کے بعد جب اس کا بھائی تخت نشیں ہوا تو اسے اندیشہ ہوا کہ ابو مسلم کہیں حکومت پر قابض نہ ہو جائے۔ دونوں میں پہلے سے کچھ کد بھی تھی، چنانچہ منصور نے اسے رومۃ المدائن میں قتل کرا دیا۔

ابو مسلم عربی و فارسی دونوں زبانوں میں فصاحت کے ساتھ گفتگو کرتا تھا۔ نہایت جری اور بہادری میں آفت و بلا تھا۔ راوی شعر تھا اور خود بھی شعر کہتا تھا۔ پست قامت گندم گوں اور خوب رو تھا۔ پیٹھ لمبی اور پنڈلیاں کوتاہ تھیں کسی کے سامنے نہ ہنستا نہ ترش روئی دکھاتا۔ گفتگو کے دوران آواز پست رکھتا۔ سنگ دل تھا، تلوار سے کوڑے کا کام لیتا۔ جب برآمد ہوتا تو چہار اشخاص اس کے آگے آگے صدائے تکبیر بلند کرتے ہوئے چلتے۔ اس کے جلوس کے دونوں کناروں کی دوری ایک فرسخ سے زیادہ ہوتی۔

بقول امام ذہبی عجیب و غریب آدمی تھا۔ انیس ۱۹ سال کی عمر میں ایک گدھے پر سوار خراسان،

میں داخل ہوا اور دس سال بعد جب مَرو سے نکلا تو پہاڑوں جیسا لشکر اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ چنانچہ ایک سلطنت پلٹ دی اور دوسری قائم کر دی۔ قوموں کی قومیں اس کے سامنے سرنگوں ہو گئیں۔ چھ لاکھ یا اس سے بھی زائد نفوس کو تہہ تیغ کیا۔

۳ احمد بن حسن متنبی (۳۰۳ھ۔۳۵۴ھ) نہایت مشہور اور بلند پایہ شاعر کوفہ میں پیدا ہوا اور شام میں نشوونما پائی۔ سیف الدولہ والیِ حلب کے دربار سے ایک مدت تک وابستہ رہا اس کی شاعری کے بہترین نمونے اسی دور کی یادگار ہیں۔ کافور اخشیدی والیِ مصر سے بھی متعلق رہا۔ اس کی مدح کی پھر ہجو بھی لکھی۔ صاحب سیف و قلم دونوں تھا۔ سیف الدولہ کے ہمراہ رومیوں کے خلاف بہت سی جنگوں میں داد شجاعت بھی دی۔

۴ بِشر حافی (۱۵۰ھ۔۲۲۷ھ) سرآمد ارباب صلاح و اہل تقویٰ۔ ان کے زہد و تقویٰ کے بہت سے عجیب و غریب واقعات ہیں۔ حدیث کے ثقہ راویوں میں بھی شمار کیے جاتے ہیں۔ بغداد میں سکونت اختیار کی اور وہیں وفات پائی۔ مامون رشید ان کی نیکی و بزرگی کا بڑا معترف تھا۔

۵ معروف کرخی (۔۔۔۔ ۲۰۰ھ) طبقہ زہاد و صوفیا کے درمیان نہایت ممتاز۔ بغداد کے قریب کرخ میں پیدا ہوئے۔ بغداد میں نشوونما پائی، وہیں فوت ہوئے مرجع خلائق تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ بھی وقتاً فوقتاً ان کے ہاں جایا کرتے تھے۔ ابن الجوزی نے ان کے احوال و اقوال ایک مستقل کتاب میں جمع کیے ہیں۔

ڈاکٹر سید حسن عباس

مولانا آزاد بلگرامی
اور
عربی زبان وادب میں انکی خدمات

زبان وادب میں یکساں مہارت اور تسلّط وعبور رکھنے والے بارہویں صدی ہجری کے ان مقتدر علما وفضلائے ہند میں ایک ہیں جن کی گرانقدر خدمات ہندوستانی مسلمانوں کے لیے باعثِ صد افتخار ہیں۔ مولانا آزاد بلگرامی نے عربی اور فارسی میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے اور نظم ونثر میں کافی علمی ادبی سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔ صاحب اتحاف النبلاء نے ان کے عربی اشعار کی تعداد دس ہزار ابیات بتائی ہے[۱] عربی زبان وادب میں مولانا آزاد بلگرامی کی عظیم خدمات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے جن میں ڈاکٹر زبید احمد[۲]، ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی[۳]

۱۔ صدیق حسن خاں: اتحاف النبلا ۔ ص ۳۳۱

۲۔ ڈاکٹر زبید احمد نے اپنی کتاب THE CONTRIBUTION OF INDIA TO ARABIC LITERATURE. LAHORE 1968 میں آزاد بلگرامی کی عربی زبان وادب کی خدمات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ مذکورہ کتاب عربی اور اردو میں ترجمہ ہوچکی ہے۔ اُردو ترجمہ پاکستان سے اور عربی ترجمہ بغداد سے شائع ہوا ہے۔

۳۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی نے آزاد بلگرامی کی گرانقدر تصنیف سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان کی تصحیح وتنقیح کا کام نہایت دل سوزی سے کیا اور علی گڑھ سے دو جلدوں میں شائع کیا۔

جناب عبدالمنان[۱]، ڈاکٹر زیتون بیگم[۲]، جناب عبدالمقصود محمد الشلغامی[۳] اور جناب عبدالسلام فہمی[۴] کی تحقیقی کاوشیں قابل ستائش ہیں۔ آزاد بلگرامی کی بزرگی اور فضیلت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ایک ایسے کتب خانے کے مالک تھے جس میں پچیس ہزار جلد کتب تھیں۔ اس سلسلے میں حافظ احمد علی شوق رام پوری کا یہ بیان دل چسپی سے خالی نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"بلگرام میں مولوی غلام علی آزاد کا کتب خانہ بھی بڑی نمود کا تھا۔ مشہور ہے کہ پچیس ہزار جلد تھی۔ میں نے خود ان کی درس گاہ کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر دسمبر ۱۸۹۸ء میں دیکھے رہنے کا مکان سلامت ہے صرف تین الماریاں ردّی سے بھری ہوئی پائیں جس میں دو دو چار چار ورق مختلف کتابوں کے پڑے ہوئے ہیں۔ دس بارہ عربی کے دیوان بھی دیکھے جو عام طور پر ہندوستان میں نہیں ملتے"[۵]

علاوہ ازیں مختلف تذکروں میں بھی آزاد بلگرامی کی علمی فضیلت، عربی و فارسی میں مہارت اور مذکورہ زبانوں میں ان کی خدمات کا ذکر بڑے اچھے پیرایہ میں ملتا ہے۔ ان تذکرہ نویسوں نے ان کے علمی فضل اور کارہائے نمایاں کا کھلے دل سے اعتراف کرنے کے ساتھ ان کے اعلیٰ اخلاق

---

[۱] جناب عبدالمنان نے آزاد بلگرامی کے عنوان سے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں ایم اے کا تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا۔

[۲] ڈاکٹر زیتون بیگم نے مکۃ معظمہ یونیورسٹی سے "غلام علی آزاد بلجرامی و تاثیر الأدبي علی لغۃ العربیہ" کے موضوع پر ۱۹۸۳ء میں ڈاکٹریٹ کا تحقیقی مقالہ سپرد قلم کرکے ڈگری حاصل کی۔

[۳] جناب عبدالمقصود الشلغامی نے دانش گاہ پنجاب لاہور سے ۱۹۷۴ء میں "شعر غلام علی آزاد بلجرامی" کے موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈگری حاصل کی۔

[۴] جناب عبدالسلام فہمی نے ۱۹۸۴ء میں "غلام علی آزاد بلجرامی و ادب الفارسی" کے موضوع پر ایک کتاب اشاعت کے لیے آمادہ کیا تھا۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ یہ کتاب شائع ہوئی یا نہیں۔

[۵] حافظ احمد علی خاں شوق رام پوری: تاریخ کتب خانہ عالیہ دارالریاستہ مصطفےٰ آباد عرف رام پور (قلمی) ص ۱۱ محزونہ کتب خانہ رضا رامپور، نمبر ۱۴۰ (فہرست مخطوطات اردو از مولانا عرشی ص ۲۶۹)

اور انسانی فضائل کا ذکر بھی کیا ہے۔ ان کی مشہورِ زمانہ کتاب "سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان" کا شہرہ سرزمین عرب میں بھی اتنا ہی رہا جتنا کہ سرزمین ہند میں۔ مسقط کے امامؒ نے اس کی تعریف کی ہے اور یہ کتاب ہندوستان کے علاوہ مصر سے بھی شائع ہوئی ہے[۲] اور اگر وہ شاعری میں خود کو "حسان الہند" کے لقب کا سزاوار گردانتے ہیں تو یہ حق بجانب بھی ہے۔

چون مدح رسولؐ کام من شد
'حسان الہند' نام من شد[۳]

یا اگر یہ کہتے ہیں:۔

در ہند چو من طوطی خوشگو نتوان یافت
ہم حرف شدم چشم غزالان حرم را
آزاد از آن شعلہ کہ دارد سخن من
افروختہ ام شمع و چراغ اُدَبم را

تو اسے شاعرانہ تعلّی پر محمول نہیں کیا جاسکتا ہے۔

آزاد بلگرامی کے عربی کلام کے نمونے بھی جا بجا ملتے ہیں مثلاً نزہۃ الخواطر جلد ششم ص ۲۰۴ تا ۲۰۵، اتحاف النبلاء ص ۳۳۱ تا ۳۳۵ اور خزانۂ عامرہ ص ۱۴۰ تا ۱۴۵، علاوہ ازیں ان کے چند مختصر دواوین شائع بھی ہو چکے ہیں جن کی تفصیل آئندہ سطور میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ عربی زبان میں مختلف موضوعات پر آزاد بلگرامی کی درج ذیل تالیفات و تصنیفات ملتی ہیں۔

۱۔ سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان

آزاد کی عربی میں سب سے مشہور کتاب یہی ہے۔ جو ۱۱۷۷ھ/۱۷۶۳ء میں تالیف کی گئی۔ جیسا کہ

---

[۱] مولوی عبدالجبار ملکاپوری: محبوب الزمن تذکرۂ شعرائے دکن جلد ۱ ص ۲۸۳ - ۲۸۴

[۲] علامہ شمس بریلوی: مقدمہ ترجمۂ مآثر الکرام (اردو) ص ۹۰ مطبوعہ کراچی

[۳] آزاد بلگرامی: خزانۂ عامرہ ص ۴ مطبوعہ کانپور ۱۸۷۱ء

اس کے عنوان سے ظاہر ہے اس کا موضوع ہندوستان سے متعلق ہے۔ یہ چار فصلوں پر مشتمل ہے:۔

فصل اوّل: تفسیر واحادیث میں ہندوستان کے بارے میں جو اشارے ملتے ہیں ان کے بیان میں۔

فصل دوم: علمائے ہند کے ذکر میں۔ اس فصل میں ۴۵ صاحب تصانیف علماء کا تذکرہ منجملہ مصنّف۔

فصل سوم: محاسن کلام کے بارے میں۔

فصل چہارم: عاشق ومعشوق کے ذکر میں (فی بیان المعشوقات والعشاق)

پہلی فصل میں آزاد نے اپنا ایک مستقل رسالہ "شمامۃ العنبر فیما ورد فی الہند من سید البشر" کو شامل کیا ہے۔ انھوں نے یہ رسالہ ۱۱۶۲ھ میں ارکاٹ میں لکھا تھا[1] فہرست کتب خانۂ آصفیہ میں اس کا سال تالیف ۱۱۹۶ھ اور مقام تالیف ٹونک بتایا گیا ہے[2] جو درست نہیں ہے۔

دوسری فصل میں جن علماء کا تذکرہ آیا ہے۔ ان کی فہرست ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی کے شائع کردہ نسخے کے مطابق درج کی جارہی ہے[3]

۱۔ أبو حفص، ربیع بن صبیح السعدی البصری (ص ۶۳)

۲۔ أبو الفیض، فیضی الاکبر آبادی (ص ۱۱۷)

۳۔ أحمد التانیسری (ص ۹۲)

۴۔ أحمد بن عبد الاحد الفاروقی السہرندی (ص ۱۲۳)

۵۔ أحمد المعروف بہ ملّا جیون الصدیقی الامیتوی (ص ۲۰۴)

۶۔ الہداد الجون فوری (ص ۱۰۵)

---

[1] آزاد بلگرامی: سرو آزاد ص ۲۹۵، مطبوعہ لاہور ۱۹۱۳ء

[2] فہرست آصفیہ ۱/۳۹۴ نیز دیکھیں، ڈاکٹر زبید احمد ص ۱۹۱ و ۳۰۴

[3] آزاد بلگرامی: سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان۔ بکوشش: ڈاکٹر فضل الرحمٰن الندوی مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۷۶ و ۱۹۸۰ء (۲ جلدوں میں)

۷۔ اُمان اللہ بن نور اللہ بن حسین البنارسی (ص ۱۹۹)

۸۔ الحسن الصغانی اللاہوری (ص ۷۰)

۹۔ حمید الدین الدھلوی (ص ۷۳)

۱۰۔ سعد الدین الخیر آبادی (ص ۱۰۲)

۱۱۔ سعد اللہ السلونی (ص ۲۲۸)

۱۲۔ شمس الدین یحیٰ الاودی (ص ۷۲)

۱۳۔ شہاب الدین بن شمس الدین بن عمر الزاولی الدولۃ آبادی (ص ۹۵)

۱۴۔ صبغۃ اللہ البروجی (ص ۱۲۰)

۱۵۔ طفیل محمد بن شکر اللہ الحسینی الاترولوی البلکرامی (ص ۲۳۰)

۱۶۔ عبد الجلیل بن أحمد الحسینی الواسطی البلکرامی (۲۰۵)

۱۷۔ عبد الحق الدھلوی (ص ۱۴۱)

۱۸۔ عبد الحکیم السیالکوتی (ص ۱۷۰)

۱۹۔ عبد الرشید الجون فوری الملقب بہ شمس الحق (ص ۱۷۲)

۲۰۔ عبد اللہ بن الہداد العثمانی التلنبی (ص ۱۰۳)

۲۱۔ عبد اللہ بن سالم البصری المکی (ص ۲۵۰)

۲۲۔ عبد المقتدر بن رکن الدین الشریحی الکندی الدھلوی (ص ۷۵)

۲۳۔ عصمۃ اللہ السہارنفوری (ص ۱۳۸)

۲۴۔ علی بن احمد المہائمی (ص ۹۷)

۲۵۔ علی بن اُحمد بن معصوم الدشتکی الشیرازی (ص ۲۱۷)

۲۶۔ علی المتقی (ص ۱۰۶)

۲۷۔ غلام علی بن نوح الحسینی (مصنّف) (ص ۲۹۸)

۲۸۔ غلام نقش بندی بن عطاء اللہ الکنوی (ص ۲۰۱)

۲۹۔ قطب الدّین السہالوی (ص ۱۹۳)

۳۰۔ قطب الدّین الشمس آبادی (ص ۱۹۶)

۳۱۔ قمر الدین الحسینی الاورنقابادی (ص ۲۶۲)

۳۲۔ محب اللہ البہاری (ص ۱۹۷)

۳۳۔ محمد بن عبد الجلیل الحسینی الواسطی البلکرامی (ص ؟)

۳۴۔ محمد حیات السندی المدنی (ص ۲۴۴)

۳۵۔ محمد زاہد بن محمد اسلم الهروی الکابلی (ص ۱۷۳)

۳۶۔ محمد طاہر الفتنی (ص ۱۰۹)

۳۷۔ محمد یوسف بن محمد اشرف الحسینی الواسطی البلکرامی (ص ۲۵۷)

۳۸۔ محمود الفاروقی الجون فوری (ص ۱۴۲)

۳۹۔ مسعود بن سعد بن سلمان اللاہوری (ص ۶۳)

۴۰۔ معین الدین العمرانی الدہلوی (ص ۹۰)

۴۱۔ نظام الدین بن قطب الدین السہالوی (ص ۲۴۳)

۴۲۔ نور الحق بن عبد الحق الدہلوی (ص ۱۴۱)

۴۳۔ نور الدین بن محمد صالح الاحمد آبادی (ص ۲۴۱)

۴۴۔ نور الہدیٰ بن قمر الدین الاورنقابادی (ص ۲۸۸)

۴۵۔ وجیہ الدّین العلوی الکجراتی (ص ۱۱۵)

تیسری فصل محاسن کلام سے متعلّق ہے اور ان صنائع و بدائع کے بیان میں ہے جنھیں ہندوستانیوں اور خود مؤلّف (آزاد بلگرامی) نے اختراع اور استخراج کی ہیں۔

چوتھی فصل، نایکا بھید یا، فی بیان المعشوقات والعشّاق، سے مربوط ہے۔

ترجمۂ فارسی سبحۃ المرجان

(الف) مولانا آزاد بلگرامی نے اپنے دو شاگردوں، مہربان اورنگ آبادی[1] اور شفیق اورنگ آبادی[2] کی فرمائش پر سبحۃ المرجان کی دو فصلوں (فصل سوم و چہارم) کا ۱۱۷۸ھ میں فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام 'غزالان الہند'[3] رکھا۔ یہ نام تاریخی ہے اور اس سے ۱۱۷۸ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔

(ب) سبحۃ المرجان کی پہلی اور دوسری فصلوں کا لفظی فارسی ترجمہ سید شمس الدین حسنی الحسینی بنارسی نے راجا ایسر پرساد کی فرمائش پر کیا تھا۔ اس کا واحد نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ نمبر ۶۵۳، نستعلیق خوش، تاریخ ترجمہ ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ء، ۱۱۲ ورق[4]

آغاز: "خدائی راکہ رب دو جہاں است

ثنایش خارج از نطق و بیان است

کند طی وادی حمد الٰہی

کرا این زہرہ و تاب و توان است"

---

[1] سید شاہ عبدالقادر معروف بہ فخری متخلص بہ مہربان (۱۱۴۲-۱۲۰۴ھ) آپ کے بہترین شاگردوں میں تھے۔ آپ نے آزاد سے کتب ادب و حدیث پڑھنے کے علاوہ شاعری میں ان ہی سے اصلاح لی۔ مہربان تخلص بھی آزاد کا عنایت کردہ ہے۔ آپ کو تصوف اور فلسفہ سے گہرا لگاؤ تھا جس کے نتیجے میں تصوف پر کئی کتابیں یادگار چھوڑیں۔ جن میں کچھ طبع ہو چکی ہیں اور کچھ غیر مطبوعہ ہیں۔

[2] لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی (۱۱۵۸-۱۲۲۳ھ) کا شمار بھی آزاد کے اہم شاگردوں میں ہوتا ہے۔ اردو اور فارسی میں شاعری کرتا تھا اردو میں صاحب اور فارسی میں شفیق تخلص تھا۔ اس کا تخلص شفیق بھی آزاد کا عطیہ ہے تذکرہ نویسی میں مہارت رکھتا تھا۔ اس کے کئی تذکرے ہیں جو اس کی شہرت کا باعث بنے۔ یہ تذکرے شائع ہو چکے ہیں۔ تذکروں کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی اس کی کئی تصانیف ملتی ہیں۔

[3] ملاحظہ ہو راقم السطور کا مقالہ 'غزالان الہند' مطبوعہ خدا بخش لائبریری جرنل شمارہ ۷۷-۷۹؛ راقم نے غزالان الہند کا متن کئی نسخوں کی مدد سے تصحیح کر لیا ہے۔

[4] Catalogne of the Arabic and Persian Mss. in the K.B.O.P. Library Patna Vol. VIII / 7-8 Ind Edition 1993

انجام: "..... وایں ہر سہ کتاب تذکرۂ شعرائے ایران وتوران وہندوستان است و روضۃ الأولیا کہ در تذکرۂ بعضی اولیا است و مآثر الکرام تاریخ بلگرام ذکر کردم در او احوال و اولیائے بلگرام و فضلا و شعرای آن را وسند اسعادات در حسن خاتمۂ سادات و دیوان شعر و رسائل دیگر۔"

ترجمہ اُردو

سیّد شمس الدّین حسنی الحسینی بنارسی (مترجم فارسی) نے اُردو میں بھی ان ہی دو فصلوں (فصل اوّل و دوم) کا لفظی ترجمہ کیا تھا اور اس کا نام "مظہر آدم" رکھا۔ یہ نام تاریخی ہے اور اس سے ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء کا سال برآمد ہوتا ہے۔ یہ ترجمہ مطبع نامی منشی نول کشور لکھنؤ سے ۱۲۳ صفحات میں ۱۲۹۵ھ میں ہی شائع ہوا مطبوعہ نسخہ کتب خانۂ انجمن ترقی اُردو کراچی میں موجود ہے اور مجھے اس کا عکس جناب مشفق خواجہ صاحب کے توسط سے حاصل ہوا۔ اس عنایت کے لیے میں موصوف کا شکر گزار ہوں۔

سبحۃ المرجان کے ایڈیشن

یہ کتاب ہندوستان میں دو مرتبہ اور مصر میں ایک بار زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہے۔

۱۔ بمبئی، ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء، ۲۹۸ صفحات

۲۔ علی گڑھ، دو جلدوں میں، پہلی جلد ۱۹۷۶ (مشتمل بر دو فصل ۔اوّل و دوم) اور دوسری جلد (مشتمل بر دو فصل ۔سوم و چہارم) بہ تصحیح و مقدمہ از ڈاکٹر فضل الرّحمٰن ندوی، ڈاکٹر ندوی نے پی ۔ایچ ۔ڈی کے لیے اس کتاب کی تصحیح کا کام کیا تھا۔ دوسری جلد ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی۔ بخط نسخ۔

۳۔ مصری ایڈیشن کا ذکر علّامہ شمس بریلوی نے مآثر الکرام کے اُردو ترجمہ (از مولانا شاہ محمد خالد میاں فاخری) کے مقدّمہ میں کیا ہے۔ یہ ایڈیشن میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔

سبحۃ المرجان کے قلمی نسخے

اس مشہور و معروف کتاب کے متعدد قلمی نسخے دنیا کے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

- دہلی، نیشنل میوزیم، بخط مولف[۱]
- لاہور، دانش گاہ پنجاب، شمارہ $\frac{Arf\ II}{۸۶۲۸}$ نستعلیق حسین بن محمد علوی، ۱۲۵۳ھ، ۳۹۲ ورق[۲]
- لکھنؤ، کتب خانہ ندوۃ العلماء، شمارہ ۱۷۹۵، نسخ، عباس بن احمد یمانی، ۱۲۹۲ھ بھوپال، ۴۳۲ ص[۳]
- حیدر آباد، کتب خانہ آصفیہ، شمارہ ۲۱۳۵[۴]
- کلکتہ، کتابخانہ مدرسہ عالیہ، شمارہ ۸۸ (تلخیص)
- لندن، برٹش میوزیم[۵]
- مانچسٹر، کتابخانہ جان ریلانڈس، شمارہ (۴۶۳) ۲۹۲

فہرست نویس نے سہواً مؤلف کا نام "جلال الدین آزاد ....." لکھا ہے جو درست نہیں ہے۔[۶]

---

۱ اس کی اطلاع مجھے پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب سے حاصل ہوئی ہے۔ موصوف نے یہ بھی بتایا کہ یہ وہی نسخہ ہے جسے آزاد بلگرامی نے مسقط کے امام کے پاس بھیجا تھا اس پر ان کے دستخط بھی موجود ہیں۔

۲ Qazi Abdul nabi kaukab: Hand list of Arabic Manuscripts in the Punjab University Library. P 290, Lahore, 1982

۳ فہرست نسخہ ہای خطی عربی کتابخانہ ندوۃ العلما لکھنؤ، جلد ۳ ص ۶۱۵، مطبوعہ مرکز تحقیقات فارسی در ہند، خانہ فرہنگ ایران، دہلی نو ۱۴۰۶ھ

۴ فہرست آصفیہ ۱/۱۶۹

۵ جلد ۳ ص ۱۰۲۲ ب و ۱۰۵۵ اب

۶ A. Mingana, D.D: Catalogue of the Arabic Mss. in the John Rylands Library, P. 462, Manchester, 1934

۷ - ۸ - فہرست کتابخانہ خدا بخش پٹنہ ۱۲/۱۵۸ - ۱۵۷؛ مفتاح الکنوز ۳/۲۰۱ (مفتاح الکنوز میں نمبر ۲۰۱۲ نستعلیق، ۱۴ ویں صدی اور ورق ۱۹۵ ملتا ہے) مرتبہ سید اطہر شیر مطبوعہ یونین پریس پٹنہ ۱۹۶۵ء

- علی گڑھ، مولانا آزاد لائبریری، ذخیرۂ احسن مارہروی، شمارہ ۷۹/۹۵۴-۱، نستعلیق خوش ۴۰۶ ص
- پٹنہ، کتابخانۂ خدابخش، شمارہ ۸۱۰، نسخ، ۱۹ویں صدی، ۱۶۴ ورق (حاشیہ پچھلے صفحہ پر)
- پٹنہ، کتابخانۂ خدابخش، شمارہ ۸۱۱، نسخ، ۱۱ر شوال ۱۱۸۰ھ/۱۷۶۷ء، ۱۴۹ ورق۔ (حاشیہ پچھلے صفحہ پر)

۲۔ ضوء الدراری شرح صحیح البخاری

مولانا آزاد نے کتاب الزکات تک صحیح بخاری کی شرح لکھی تھی۔ انھوں نے یہ شرح حرمین شریفین کے قیام کے زمانے میں یعنی ۱۱۵۱ھ میں لکھی۔ وہ اس وقت حج کے لیے وہاں گئے ہوئے تھے لیکن تاخیر سے پہنچنے پر مناسک حج ادا نہ کر سکے تو پھر وہیں مقیم ہو گئے تاکہ آئندہ سال حج سے مشرف ہو سکیں۔ اس درمیان انھوں نے وہاں شیخ عبدالوہاب طنطاوی اور شیخ محمد حیات سندھی سے حدیث و تفسیر اور دیگر علوم دینیہ کی تحصیل کی۔ مذکورہ رسالے میں شرح کے ہمراہ متن بھی ہے۔ اس کا واحد قلمی نسخہ کتابخانۂ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں موجود ہے۔ نمبر ۳۶۴، نستعلیق، بخط مصنف ۱۱۵۱ھ ۱۴۶ صفحہ، ۲۳ سطر۔[1]

نواب صدیق حسن خاں بھوپالی صاحب ابجد العلوم نے نسخۂ مؤلف کو دیکھا تھا۔ حکیم عبدالحی صاحب نزہۃ الخواطر نے بھی نواب صاحب کے صاحبزادے سید نورالحسن کے کتب خانے میں اس نسخہ کو دیکھا تھا۔ علاوہ ازیں نواب صدیق حسن خاں نے اپنی کتاب "الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ" میں آزاد کے اس رسالے کا ذکر کیا ہے۔[2]

۳۔ شفاء العلیل فی اصلاح کلام ابو الطیب المتنبیؒ

آزاد بلگرامی نے اس رسالے میں مشہور عرب شاعر المتنبیؒ کے کلام میں معانی و بیان کی فرو گذاشتوں کی نشاندہی کی ہے اور بسا اوقات اصلاح بھی کی ہے۔ اس کا سال تالیف ۱۱۹۶ھ

---

[1] فہرست ندوہ ۳/۱۱۶ و زبید احمد ص ۳۰۴

[2] الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ ص ۲۲۶، مطبوعہ اسلامی اکیڈمی لاہور، ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء

ہے۔ یہ رسالہ بھی اپنی نوعیت کا نہایت اہم رسالہ ہے۔ ظاہر ہے متنبی جیسے شاعر کی فروگذاشتوں کی نشاندہی آزاد جیسا باکمال ہی کر سکتا تھا۔ اس رسالے کے متعدد قلمی نسخے درج ذیل کتب خانوں میں ملتے ہیں:

- حیدرآباد، کتب خانہ آصفیہ، شمارہ ۱۱۱۳ درفن دواوین عربی۔
- حیدرآباد، کتب خانہ سید علی حسین بلگرامی۔[۱]
- حیدرآباد، سالار جنگ میوزیم۔[۲]
- لکھنؤ، کتابخانہ ندوۃ العلماء، شمارہ ۱۴۵۵، نستعلیق، سید نورالحسن قنوجی، ۵۰ص، ۲۵سطر۔[۳]

پروفیسر نثار احمد فاروقی نے سالار جنگ کے مذکورہ دونوں نسخوں کی مدد سے اس رسالے کے متن کی تصحیح کی ہے اور اپنے مفید حواشی سے مزین کر کے مجلہ ثقافت الہند (دھلی) جلد ۲۵ شمارہ ۳/۴ اور جلد ۲۶ شمارہ ۱/۲ میں شائع کیا ہے۔ ابھی پورا رسالہ طبع نہیں ہو سکا ہے لیکن امید ہے کہ بہت جلد کتابی صورت میں منظر عام پر آجائے گا۔

۴۔ شمامة العنبر فی ماورد فی الہند من سید البشر

مؤلف نے اس مختصر سے رسالے میں اُن احادیث کو جمع کر دیا ہے جو ہندوستان سے متعلق ہیں۔ آزاد سے پہلے کسی نے بھی اس پہلو پر توجہ نہیں دی تھی۔ انھوں نے ۱۱۶۲ھ میں ارکاٹ میں اسے تالیف کیا اور سبحة المرجان میں شامل کیا ہے۔ کتب خانہ آصفیہ میں اس رسالے کے تین نسخے ملتے ہیں

۱؎ Nazir Ahmad: Note on Important Arabic and Persian MSS. Found in Various Libraries in India Journal of Royal Asiatic Society of Bengal New series Vol. XIII P.c. xxxis, 1917

۲؎ مجلہ منادی دہلی، جلد ۶۷ شمارہ ۴/۵ ۱۹۹۲ء

۳؎ فہرست ندوہ ۳/۴۳۴

نمبر ۸۵۳ - ۸۵۷ اور ۸۵۹ ہیں۔

ایک اور نسخہ کتابخانہ حضرت پیر محمد شاہ درگاہ شریف احمد آباد میں ہے جس کا نمبر ۱۹۷ ہے۔ یہ نسخہ خط نسخ میں مورخہ ۶ ذی قعدہ ۱۲۲۴ھ کا ہے۔ اس کی کتابت بندر سورت میں ہوئی ہے۔ اس میں ۷۵ ورق ہیں [1]

۵۔ مثنوی مظہر البرکات

مولانا آزاد بلگرامی نے مثنوی مولانا روم کی تقلید میں عربی میں سات دفتروں میں یہ مثنوی تالیف کی۔ اور دعویٰ کیا ہے کہ ان سے پہلے کسی نے بھی بحر خفیف میں مزدوجہ نہیں کہا ہے۔ اس مثنوی میں انھوں نے فلسفیانہ، متکلمانہ اور عارفانہ افکار کو مثنوی معنوی کی طرح مختصر حکایتوں اور داستانوں نیز تمثیلوں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس مثنوی کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی نے مجلۂ علوم اسلامیہ علی گڑھ دسمبر ۱۹۶۰ء کے شمارے میں نہایت عمدہ مقالہ سپردِ قلم کیا تھا۔ انھوں نے اپنے مذکورہ مقالے میں علی گڑھ کے نسخے کو متعارف کرایا ہے۔ مثنوی مظہر البرکات کو آزاد نے ۱۱۹۳ھ سے ۱۱۹۶ھ کے دوران مکمل کیا۔

واضح رہے کہ آزاد نے ابتدا میں اسے چار دفتروں میں تالیف کیا تھا مگر بعد میں اپنے پوتے امیر حیدر بن نور الحسن کی فرمائش پر تین دفتروں کا اضافہ کیا۔ جن کی تفصیل یہ ہے :۔

دفتر اول: سال تالیف ۱۱۹۳ھ/ ۱۷۷۹ء اورنگ آباد میں، بمدت ایک سال۔

دفتر دوم: " " ۱۱۹۴ھ/ ۱۷۸۰ء حیدر آباد میں تقریباً ۵ ماہ کے دوران۔

دفتر سوم: و چہارم: اورنگ آباد میں جمادی الآخر ۱۱۹۵ھ میں شروع کیا اور شعبان ۱۱۹۵ھ میں مکمل کیا۔

---

[1] حضرت پیر محمد شاہ درگاہ شریف کتب خانہ؛ عربی، فارسی، اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست، جلد دوم ص ۱۵۳، ناشر محمد بھائی ٹوپی والا سکریٹری درگاہ شریف ٹرسٹ احمد آباد۔ ۱۹۹۳ء

دفترِ پنجم، ششم و ہفتم: سال تالیف ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء۔

دفترِ اوّل میں حمد نہیں ہے لیکن دیگر تمام دفتروں میں حمد موجود ہے اور ہر دفتر کے آخر میں ایک خاتمہ بھی ہے۔

یہ مثنوی ابھی غیر مطبوعہ ہے اور اس کے قلمی نسخے درج ذیل کتب خانوں میں موجود ہیں۔

- حیدرآباد، کتب خانۂ آصفیہ، بخط مؤلف[1]
- مانچسٹر، کتابخانہ جان ریلانڈس، ۴۸۱ الف (از ص ۳ ب۔۱۷۴ الف) یہاں وظہر البرکات لکھا گیا ہے جو درست نہیں ہے[2]
- کتابخانہ برنسٹن[3]
- علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، کتابخانہ مولانا آزاد، ذخیرۂ احسن مارہروی، شمارہ ۸۹۱/۱، نستعلیق خوش، محمد قاسم علی، ۱۳۰۲ھ ۳۶۸ ورق (از ۳۴۹ تا ۳۷۵ ورق قصیدۂ مرأۃ الجمال)
- علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، کتابخانہ مولانا آزاد، ذخیرۂ حبیب گنج، شمارہ مسلسل ۴۴۷، شمارہ نسخہ ۳۰/۳۰ .H.G، نستعلیق، ذوالفقار احمد ابن سید ہمت علی نقوی بھوپالی، ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء مقابلہ شدہ در ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء، ۱۲۲ ورق[4]
- لکھنؤ، کتابخانہ ندوۃ العلماء، شمارہ ۳۰۷/۵۰۲۰[5]
- پٹنہ، کتابخانہ خدابخش، شمارہ ۲۶۴۱، از ورق ۱ الف تا ۱۲۷ ب۔ اس نسخہ کے آخر میں ورق ۱۲۸

---

[1] قاموس العلوم ستون ۳۶

[2] فہرست مخطوطات عربی کتابخانہ جان ریلانڈس مانچسٹر ص ۸۰۶

[3] فہرست مخطوطات عربی کتابخانۂ برنسٹن ۱۹۲۸ء بہ نقل از تذکرہ نویسی فارسی در ہندوپاکستان از ڈاکٹر علی رضا نقوی ص ۲۷۰ مطبوعہ تہران ۱۹۶۴ء

[4] M.M. Qaiser. Descriptive Catalogue of Arabic MSS. of Habibganj Collection Maulana Azad Library Aligarh, p 337, Aligarh 1993

[5] فہرست ندوہ ۶۵۴/۳

الف سے ۱۳۲ ب تک مرأۃ الجمال ہے[۱]

۶۔ دواوین عربی

عربی زبان میں آزاد کے دس دواوین ہیں۔ ان دواوین کا دو انتخاب تیار کیا گیا۔ ایک "السبعۃ السیارۃ" نواب صدیق حسن خاں[۲] کے لیے اور دوسرا "مختارات دیوان آزاد" کے نام سے ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں مطبع آسی لکھنؤ سے شائع ہوا۔ السبعۃ السیارہ کا مخطوطہ بخط آزاد کتابخانہ نورالحسن ابن نواب صدیق حسن خاں لکھنؤ میں تھا[۳]۔ صاحب نزہتہ الخواطر نے اس دیوان کو کتابخانہ نورالحسن لکھنؤ میں دیکھا تھا[۴]۔

آزاد کے یہ دواوین مختلف اوقات میں مختصر جزو کی صورت میں شائع بھی ہوئے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:-

الدیوان الاول: مطبع کنز العلوم حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔ تعداد صفحات ۶۱۔ سال تالیف ۱۱۸۷ھ

۱۔ فہرست کتابخانہ خدابخش پٹنہ ۲۳/۱۵۱-۱۴۸؛ مفتاح الکنوز ۱/۲۰۶، شمارہ ۱۸۳۸ کے تحت مظہر البرکات کا سنہ کتابت سنہ ہزار لکھا گیا ہے جو درست نہیں ہے۔

۲۔ نواب صدیق حسن خاں: اتحاف النبلاء ص ۳۳۱ ــ نواب صدیق حسن خاں لکھتے ہیں:

"ہفت دیوان عربی مسمّی بہ سبع سیارہ، ودروی قصاید، مستزاد ومردف ومزدوحہ وترجیع است کہ ہیچ شاعری قبل ایشان این چنان نظم کردہ وہرگز از اہل ہند بہ ساعت نرسیدہ کہ او را یک دیوان عربی باشد تا بہ ہفت دیوان چہ رسد۔ درین دواوین در مدح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معانی کثیرہ نادرہ ایجاد فرمودہ کہ مثل آن ہیچ یکی را از شعرای مغلقین وفصحای متشدقین میسر نگشتہ وی حسان ہند است"
(اتحاف النبلاء ص ۳۳۱)

۳۔ Nazir Ahmad: J.R.A.S.B. New Series, Vol. XIII p. cxxxix-1917 Wajahat Husain: J.R.A.S.B. Vol. II No 2. 1936

۴۔ مولانا عبدالحی: نزہتہ الخواطر ۶/۲۰۲

الدیوان الثانی: مطبع نوح محفوظ حیدر آباد دکن، تعداد صفحات ۵۸ سال تالیف ۱۱۸۷ھ

الدیوان الثالث: مطبع کنز العلوم حیدر آباد دکن، تعداد صفحات ۴۸، سال تالیف ۱۱۸۷ھ[۱]

الدیوان الرابع: ۱۱۹۰ھ (غالباً سال تالیف ہے۔)

الدیوان الخامس[۲] والدیوان السادس والسابع: ۱۱۹۴ھ (یہ بھی غالباً سال تالیف ہے)

الدیوان الثامن[۳]: اس دیوان کا مخطوطہ کتابخانہ مکتبہ شیخ الاسلام عارف حکمت مدینہ منورہ میں موجود ہے۔ اس کی تاریخ ۹۹۰ھ بتائی گئی ہے جو صحیح نہیں ہے، ورق ۵۵

الدیوان التاسع[۴] معروف بہ "تحفۃ الثقلین" مطبع نور الانوار، آرہ (بہار) سے ۱۲۹۴ھ میں شائع ہوا۔ اس دیوان کا مخطوطہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کتابخانہ مولانا آزاد میں موجود ہے نمبر ۱۱۷ ع ۸۹۲/۲۹۸ ع ۱/

الدیوان العاشر: دیوان نہم اور دہم کے نسخے ذخیرہ سبحان اللہ علی گڑھ میں موجود ہیں۔

اس کے علاوہ دیوان آزاد کے کچھ نسخے درج ذیل کتب خانوں میں بھی ملتے ہیں۔

- حیدر آباد، کتابخانہ آصفیہ، شمارہ ۱۰۹
- رام پور، کتابخانہ رضا، شمارہ ۷، ۹، نستعلیق، ۲۹۸ ورق، بہ نام دیوان آزاد، دراوّل شرح قصیدہ نونیہ، ناقص الطرفین[۵]

[۱-۲] ڈاکٹر جمیل احمد: حرکۃ التالیف باللغۃ العربیہ فی الاقالیم الشمالی الھندی ص ۱۳۲ مطبوعہ وزارۃ الثقافۃ والارشاد القومی، دمشق ۱۹۷۷ء؛ نیز رجوع کریں۔

Sarkis: Dictionaire encyclopedique de bibliographic arabe.

[۳] نسخہ ہای خطی دفتر پنجم، دانش گاہ تہران ص ۹۲۴؛ معارف اعظم گڑھ ج ۱۸ ص ۳۳۹

[۴] ڈاکٹر جمیل احمد: حرکۃ التالیف باللغۃ العربیہ... ص ۱۳۲؛ نیز رجوع کریں: زبید احمد ص ۸۲ و مقدمہ سبحۃ المرجان از فضل الرحمٰن ندوی ص ۱۱ (بزبان انگریزی)

[۵] فہرست کتب عربی موجودہ کتب خانہ ریاست رام پور (رضا) جلد اول ص ۵۸۶، مطبوعہ رام پور مئی ۱۹۰۲ء

- پٹنہ، کتابخانہ خدابخش، شمارہ ۷۰، ۳۳، نستعلیق، ۱۲ویں صدی، ۲۰۰ ورق [۱]
- پٹنہ، کتابخانہ خدابخش، شمارہ ۳۹۵۹، نسخ، ۱۱۰۷ھ، ۵۶ ورق، بنام " دیوان وقصاید غلام علی آزاد بلگرامی"، ورق آخر بخط آزاد [۲]
- ایران، تہران، کتابخانہ مرکزی دانش گاہ تہران، شمارہ ۱۰۴۷۵ (فہرست نشدہ)
- لندن، برٹش میوزیم، شمارہ OR 8269 (فہرست نشدہ)

۷۔ تسلیۃ الفواد فی قصاید الآزاد

یہ آزاد کے چند قصاید کا مجموعہ ہے۔ اس کا مخطوطہ کتابخانہ عارف حکمت مدینہ منورہ میں موجود ہے۔ (رجوع کریں: زبید احمد ص ۲۴۹)

۸۔ مرآۃ الجمال

ایک سو پانچ اشعار پر مشتمل ایک عربی نظم ہے جس میں آزاد نے معشوق کے سراپا کی خوبیوں کا بیان کیا ہے۔ انھوں نے یہ نظم ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء میں کہی۔ اسٹوری نے بھی اس نظم کا تذکرہ کیا ہے لیکن اس نے آزاد کی ایک فارسی مثنوی کو جس کا عنوان، سراپائے معشوق ہے اور اس میں بھی آزاد نے معشوق کے سراپا کی تعریف بیان کی ہے، اور مرآۃ الجمال کو ایک ہی سمجھا ہے [۳]۔ جبکہ یہ دو الگ زبانوں میں ہیں۔

۹۔ اوج الصبا فی مدح المصطفیٰ [۴]

حضرت پیغمبر اکرم (ص) کی مدح میں اس قصیدے کا مخطوطہ کتابخانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہے۔

۱-۲ مفتاح الکنوز ۳/۱۲۹

۳ اسٹوری: جلد اول، حصہ دوم ص ۸۶۲؛ زبید احمد نے تفصیل سے اس مثنوی کے محاسن بیان کئے ہیں۔ ص ۲۵۰-۲۵۴؛ برائے نسخہ ہای خطی رک بہ: فہرست کتابخانہ خدابخش ۲۳/۱۵۰ و علی گڑھ ذخیرۂ احسن مارہروی۔

۴ فہرست ندوہ ۴/۶۴۸

شمارہ ۱۴۲۳ نستعلیق ۹۶ص۔

۱۰۔ نصاب القصیدہ فی التغزل

اس کا ذکر ڈاکٹر جمیل احمد نے اپنی کتاب حرکۃ التالیف باللغۃ العربیہ ... ص ۱۳۵ پر کیا ہے۔

۱۱۔ مکتوبات حضرت مجدد

آزاد نے شیخ مجدّد سرہندی کے بعض خطوط کا عربی میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کا ذکر حیاتِ جلیل جلد دوم ص ۱۷۵ پر ملتا ہے۔[۱]

---

[۱] مقبول احمد صمدانی: حیات جلیل، مطبوعہ الہ آباد ۱۹۲۹ء (اردو) دو جلد در یک مجلد

خطیب الرحمٰن ندوی

عربی زبان کا مقام اور دوسری زبانوں میں اس کے اثرات

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس عربی زبان کا انتخاب اس لیے فرمایا کہ وہ اس کے زندہ جاوید کلام کی تعبیر کا وسیلہ بن سکے۔ اسی زبان سے قرآن کریم اور حدیث پاک سمجھا جاتا ہے۔ یہی احکام شریعت اور ان تمام امور کے پہچاننے کا ذریعہ ہے جن کا تعلق مذہب اسلام سے ہے۔ اس ربّانی اعزاز و شرف کی وجہ سے عربی زبان کو رفعت وعظمت حاصل ہوتی۔ اگر (خدانخواستہ) قرآن نہ ہوتا تو عربی زبان دنیا کی صدہا زبانوں جیسی ایک عام زبان ہوتی۔ بلکہ یوں کہئے کہ قرآن نہ ہوتا تو نہ جانے کب وہ طاقِ نسیاں ہو چکی ہوتی۔ اور اس کے بجائے بہت سے لہجات پیدا ہو گئے ہوتے۔ اور یہ لہجات باہم مختلف اور متغایر ہو کر رفتہ رفتہ ایسی مختلف زبانوں میں تبدیل ہو گئے ہوتے کہ ایک زبان کا بولنے والا دوسری زبان کو نہ سمجھ پاتا۔ کیونکہ زبانوں کا یہ دستور ہے کہ وہ طویل زمانہ تک زندہ وتابندہ نہیں رہتی۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ بڑی بڑی زبانیں رائج ہوئیں اور ان پر زوال آیا۔ چنانچہ لاطینی زبان جو رومانی شہنشاہیت کی سرکاری زبان تھی صدیوں تک رائج رہی، بالآخر زوال پذیر ہو گئی۔ اور اپنے پیچھے متعدد لہجات چھوڑ گئی۔ مثلاً اسپینی، پرتگالی، اطالوی، فرانسیسی، اور رومانی

زبان کی شکل میں تبدیل ہو گئے۔

اور یہی حال سنسکرت زبان کا ہوا کہ وہ ماضی بعید میں کئی صدیوں تک ہندوستان کی زبان رہی، اس پر زوال آیا، اور مستقل زبانوں میں تبدیل ہو گئی، اور اس کی نئی نئی شکلیں مثلاً ہندی، پنجابی، بنگالی، سندھی، گجراتی وغیرہ وجود میں آئیں۔ اسی طرح اس کے علاوہ کچھ ایسی زبانیں بھی ملیں گی جو فنا تو نہ ہوئیں اور نہ متعدد لہجات میں تبدیل ہوئیں مگر ان میں ایسا مکمّل تغیّر پیدا ہوا کہ چند صدیوں پہلے کی حالت سے یکسر مختلف ہو گئیں۔ مثال کے طور پر یونانی اور انگریزی زبانیں ہیں اہل یونان موجودہ زمانہ میں جدید یونانی زبان بولتے ہیں، اور سقراط و ارسطو اور افلاطون کی زبان نہیں سمجھ پاتے ۔ ۔ ۔ ۔ اور رہا سوال انگریزی زبان کا تو وہ تین مرحلوں سے گزر چکی ہے۔ ایک قدیم انگریزی زبان (جس کا زمانہ چھٹی صدی سے دسویں صدی تک ہے) دوسرے وسطی انگریزی زبان (جس کا زمانہ گیارہویں صدی سے تیرہویں صدی تک ہے) اور تیسرے جدید انگریزی، اور قدیم وجدید کا فرق اس قدر ہے کہ آج کا انگریزی بولنے والا قدیم انگریزی کا ایک جملہ بھی نہیں سمجھ سکتا۔

قدیم انگریزی زبان کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

SIGAN THAE TO SLEAPE SUN SARE ANGIELT EVEN RAESTS

(وہ لوگ سو گئے اور شام کے آرام کی مہنگی قیمت چکائی)

مگر عربی زبان وہ واحد زبان ہے جو دو ہزار سال کی طویل مدّت کے باوجود بھی تغیر پذیر نہ ہوئی۔ اور امراؤ القیس کا کلام قفا نبك من ذكرى حبيب ومنزل الخ جو ڈیڑھ ہزار سال پہلے کہا گیا ہم اس کو آج بھی اسی طرح سمجھ لیتے ہیں جس طرح امراؤ القیس اور اس کے معاصرین نے سمجھا تھا۔ اس تمہید کے بعد جس میں عربی زبان کا دوام اور بقا، مذکور ہوا اب عربی زبان کی دوسری زبانوں میں تاثیر پر گفتگو کی جارہی ہے۔

عربی زبان نے مشرق و مغرب کی بہت سی اہم زبانوں پر اثر ڈالا ہے، ہم یہاں پہلے عربی زبان کے مشرق کی بعض اسلامی زبانوں پر ان اثرات کا ذکر کریں گے جو حروف اور کلمات اور عروض سے متعلّق ہیں۔

اولاً حروف:۔

اسلامی زبانیں مثلاً فارسی، ترکی، اُردو، جاوی، افغانی، اور سندھی زبانیں عربی حروف میں لکھی جاتی ہیں، فارسی زبان پرانے زمانے میں قدیم فارسی حروف میں لکھی جاتی تھیں، مگر اہل فارس نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی اصلی زبان کے حروف متروک کر دیئے اور اس کی کتابت کے لیے عربی حروف کو اختیار کیا، کچھ زبانیں ایسی بھی ہیں جو اپنے اصلی حروف کے ساتھ ساتھ عربی حروف میں بھی لکھی جاتی تھیں۔

اسپینی زبان جس کو اندلس کے اسلامی عہد میں مسلمان عربی حروف میں لکھا کرتے تھے اور اس کے رسم الخط کا نام الجامعة (ALJAMIA) تھا۔ یہی حال جنوبی ہند کی تاملی اور ملیباری زبان کا ہے جن کو ان زبانوں کے جاننے والے مسلمان عربی حروف میں لکھتے اور بولتے ہیں چونکہ ان زبانوں میں موجود بعض اصوات سے عربی حروف ناآشنا تھے اس لیے ضروری ہوا کہ ان اصوات کے لیے عربی حروف میں نقطے یا خط وغیرہ کی زیادتی سے ایسی تبدیلی کی جائے کہ عربی حروف ان زبانوں کی تمام اصوات کا استیعاب کر سکیں۔

ذیل میں اس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

پ ۔ تین نقطوں کے ساتھ بار مہموسہ کے رمز کے لیے، جو بہت سی زبانوں میں موجود ہے۔

چ ۔ تین نقطوں کے ساتھ جیم مہموسہ کے رمز کے لیے فارسی اور اردو میں،

گ ۔ ایک خط کی زیادتی کے ساتھ کاف کے رمز کے لیے ۔

ڈ ۔ دال ہے جس پر طار صغیرہ رکھ دی گئی ہے۔

ڠ ۔ تین نقطوں کے ساتھ جاوی زبان میں نون طباقی کے رمز کے لیے رہے۔

ثانیاً۔ کلمات

عربی الفاظ اس کثرت سے ان زبانوں میں داخل ہوئے کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ بسا اوقات ان زبانوں میں پورے کے پورے جملے اور اشعار ایسے ملیں گے جو تقریباً عربی کلمات ہی سے بنائے گئے ہیں جیسے اُردو میں اس کی مثال اقبال کا یہ شعر ہے۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

اقبالؔ کے اس شعر کا پہلا مصرع سات ایسے کلمات پر مشتمل ہے جن میں چھ عربی ہیں اور فارسی میں حافظ شیرازی کا قول

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما ‏ مصرع

کل سات کلمات پر مشتمل ہے جن میں چار عربی ہیں۔

اس موقع پر ہمیں مشہور شاعر و ادیب فراق گورکھپوری۔ جو ہندو مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ بات یاد آتی ہے جو انھوں نے ان متعصبین کا رد کرتے ہوئے کہی ہے جو عربی الفاظ ہندی زبان سے نکال دینا چاہتے ہیں، فراق نے کہا ،،عربی الفاظ سے نفرت کرنے والے متعصبین کو جان لینا چاہیئے کہ خود لفظ ،، ہندی،، عربی ہے،، قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ عربی کی یائے نسبتی تو بیشتر زبانوں کا جزء لاینفک بن گئی ہے خواہ اردو زبان ہو یا فارسی یا ترکی بلکہ انگریزی بھی۔

انگریز بولتا ہے:۔ IRAQI, PAKISTANI, SAUDI, KUWAITI

ثالثاً۔ عروض

شاذونادر ہی کوئی زبان دوسری زبان کی بحور کو قبول کرتی ہے، کیونکہ بحور کا ارتباط لغت کے اصوات اور اس کی صوتی، نحوی ترکیب سے بڑا گہرا ہوتا ہے۔

انگریزی زبان نے یونانی زبان سے صرف اس کے نام اور عدد تفاعیل کو اخذ کیا، اور تفاعیل کی اساس یونانی زبان میں طول و قصر ہے اور انگریزی زبان میں نبر اور عدم نبر ہے لیکن عربی بحور بہت سی زبانوں میں داخل ہوئیں، اردو، فارسی اور ترکی زبان میں تو عربی بحور کے علاوہ کوئی بحر ہے ہی نہیں، یہ صحیح ہے کہ ان زبانوں نے کچھ بحروں میں بعض تفاعیل کے حذف و اضافہ سے تبدیل و ترمیم کی، اور بعض بحور کو ایجاد بھی کیا، مگر ان تمام صورتوں میں بھی انھوں نے عربی تفاعیل کو برقرار رکھا ہے۔ مثال ملاحظہ فرمائیے کہ بحر ہزج جس کی تفاعیل

مفاعیلن / مفاعیلن / مفاعیلن / مفاعیلن ہے

جیساکہ شاعر کا یہ قول ہے۔

عفامن آل لیلی السھب فالاملاح فالغمر

یہاں چار مفاعیلن ہیں لیکن اردو، فارسی اور ترکی زبانوں نے تبدیلی پیدا کرکے آٹھ مفاعیلن بنایا ہے، اس کی مثال ڈاکٹر اقبال کا یہ شعر ہے۔

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

اور فارسی میں حافظ شیرازی کا شعر

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ مارا
بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

اور ترکی میں شاعر وجدی کا کلام۔

BENIM DİR NEVBET-İ FERY AD BULLULLER
HAMUS FIG ANIM EHL-İ ASKA MAYE-I-
OLSUN.- CUS U RURUS OLSUN.

اب ملاحظہ فرمائیے کہ یورپ کی زبانوں پر عربی زبان کا کیا اثر پڑا۔ یورپ کی مختلف زبانوں میں صدہا عربی الفاظ داخل ہوئے۔ یہ الفاظ تین راستوں سے داخل ہوئے۔ اولاً اندلس، عرب مسلمانوں نے یورپ کے اس حصہ پر کئی صدی تک حکمرانی کی ہے، جس کے نتیجہ میں سیکڑوں عربی کلمات اسپینی زبان میں داخل ہوئے، اسپینی زبان دیگر تمام یورپی زبانوں سے زیادہ عربی الفاظ سے مالامال ہوئی ہے، اور اس کے ذریعہ کچھ کلمات (الفاظ) یورپ کی اور زبانوں مثلاً اطالوی، فرانسیسی اور انگریزی میں منتقل ہوئے۔ اب اسپینی زبان میں عربی الفاظ کی کچھ مثالیں بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

الوزیر۔ اس کا جدید معنی شرطی اور پولیس ہے ALGUACIL

الحناء ALHENA

صبغ بالحنا ALHENAR

الأمين		AL AMIN
البرذعة		AL BARDA
البيطار		AL BEITAR
البطانة	ومعناها الآن سياج حول الشجرة	AL BITANA
البحيرة	ومعناها الآن الخزّان پانی کی ٹنکی، پانی روکنے کا بند	AL BUHERA
القائد	ومعناه الآن حاكم حصن السجان	ALCAIDE
القاضی	ومعناه الآن رئيس البلدية میونسپل چیرمین	ALCALDE
القطيفة	ومعناها الآن السجاد قالین	ALCATIFA
القصر	ومعناه الآن الحصن قلعہ	ALCAZAR
القبة	ومعناها الآن غرفة النوم سونے کا کمرہ	ALCOVA
الكوز	ومعناه الآن قارورة للزيت تیل کی شیشی	ALCUZA
الغرفة	ومعناها الآن مستودع الحبوب غلّے کی گودام	ALGORFA
فلان		FULANO
حافظ	ومعناها الآن المشرف نگران	HAFIZ

ثانیاً۔ صلیبی جنگیں۔

ان صلیبی جنگوں میں جو مدتہائے دراز تک جاری رہیں، یورپ کی مختلف اقوام کا ان مسلمانوں سے میل جول ہوا جو عربی زبان بولنے والے تھے۔ اس میل جول کی وجہ سے ان اقوام کی زبانوں میں عربی کے بہت سے الفاظ آئے، ایک انوکھا لفظ جو اس وقت یورپ کی زبانوں میں داخل ہوا وہ انگریزی اور فرانسیسی زبان کا لفظ ASSASSIN ہے جس کو اطالوی زبان میں ASSASSINO اور اسپینی زبان میں ASESINO کہا جاتا ہے۔ اس لفظ کا معنی "کسی کو دھوکہ سے قتل کرڈالنے والا" ہے، اس لفظ کا اشتقاق حشّاشین سے ہے اور حشاشین قرامطہ کے جنگی رضا کاروں کو کہا جاتا تھا جو اپنے دشمنوں کو حشیش کے زیرِ اثر قتل کردیتے تھے، یہ لفظ یوربین زبان میں بہت مستعمل ہے، اس سے فعل

کا اشتقاق بھی ملتا ہے، چنانچہ انگریزی میں ASSASSINATE اور فرانسیسی زبان میں ASSASSINER اسپینی زبان میں ASESINAR اور اطالوی زبان میں ASSASSINARE ہے۔

تیسرا طریقہ جس کے واسطے عربی الفاظ یورپ میں آئے عربی کی علمی کتابوں کے لاطینی اور دیگر یورپی زبانوں میں تراجم ہیں، عربی کتابوں کے ان تراجم کے واسطے سے یورپ کی زبانوں میں عربی کی علمی اصطلاحیں داخل ہوئیں جن کا بیشتر حصہ آج بھی مستعمل ہے، اسی طرح ان بہت سے اہم کلمات میں جو یورپ کی زبانوں میں داخل ہوئے۔ لفظ صفر ہے۔ اس لفظ نے مختلف زبانوں میں مختلف شکل اختیار کی ہے۔ مثلاً CYEHER، ZERO، CIFHER ان میں آخری کلمہ کی اصل ZEFIRO تھی، فار کو حذف کرکے ZERO بنالیا گیا۔

جب علماء مغرب نے عربی ارقام کو استعمال کرنا شروع کیا تو عوام متحیر تھے اور ان عزیب و نامانوس ارقام کو سمجھ نہ پاتے تھے، اور ان کو یہ ارقام معمہ اور چیستان معلوم ہوتے، چونکہ یہ صفر نظام جدید کی اساس تھا اس لیے کلمہ صفر اپنے اصلی معنی سے منتقل ہوکر اس نظام پر دلالت کرنے لگا۔

اس معنی کے لحاظ سے صفر کو انگریزی زبان میں CIFHER اور اطالوی زبان میں CIFRA اسپینی زبان میں CIFRA اور فرانسیسی زبان میں CHIFFRA کہتے ہیں، اور یہی فرانسیسی لفظ جس کو ہم نے اس وقت شفرۃ کی صورت میں معنی لغت سرّیہ یا کتابت سرّیہ لے لیا ہے، گویا معنی اور صورت کی تحریف کے بعد ہماری طرف واپس آگیا ہے۔

ریاضی کی اصطلاح میں ایک لفظ الجبر آتا ہے، انگریزی، اطالوی اور اسپینی زبان میں اس لفظ نے ALGEBRA کی صورت اختیار کرلی اور فرانسیسی زبان میں اولاً ALGEBRA پھر ALGORISM کی صورت اختیار کی اس کا مفہوم ہے حساب یا شمار کرنے کا عربی نظام (طریقہ) اسی طرح کچھ اور کلمات علمیہ ہیں مثلاً ALCHEMY جس کی اصل الکیمیا ہے اور ALKALI اس کی اصل القلی ہے اور ALKOHOL اس کی اصل الکحول ہے۔

یہ ان الفاظ کے نمونہ تھے جن کو اہل یورپ نے عربی زبان سے حاصل کیا، اب ہم کچھ ایسے

عربی الفاظ کا ذکر کریں گے۔ جو یورپ کی زبانوں میں مختلف میدانوں میں داخل ہوئے۔

۱۔ تجارت

نرخوں کی فہرست کے لیے انگریزی TARIFF کا لفظ آتا ہے جس کی اصل عربی تعریفہ ہے، اسپینی کلمہ TARIFA نیز اطالوی کلمہ TARIFFA عربی سے زیادہ قریب ہے۔ ایک دوسرا لفظ AVARIA اطالوی زبان میں اور لفظ AVERIA اسپینی زبان میں اور AVARIE فرانسیسی زبان میں اور AVERAGE انگریزی زبان میں ہے۔ اس کا معنی ایسی خرابی جو کشتی میں یا لدے ہوئے سامانوں میں پیدا ہو جائے۔ اصلاً یہ لفظ عواریہ تھا جو عوار بمعنی عیب سے بنا لیا گیا ہے جیسے سلعۃ ذات عوار وہ سامان جس میں عیب ہو۔

ایک اور لفظ ملاحظہ فرمائیں۔ اسپینی اور اطالوی زبان میں TARA، انگریزی اور فرانسیسی زبان میں TARE آتا ہے یعنی لادنے سے پہلے کشتی کا وزن، اور یہ عربی کے لفظ ,,طرح،، سے بنایا گیا ہے یا اس کا معنی لفافہ اور کھول جو سامان پر لگایا جائے۔

الملاحۃ۔ جہاز رانی

اس میدان کا اہم لفظ انگریزی زبان میں ADMIRAL ہے جس کی اصل ,,امیر البحر،، ہے اس میں تحریف کی گئی اور لفظ بحر کو نکال دیا گیا، تو امیرال ہوا۔ فرانسیسی زبان میں یہی لفظ AMIRAL موجود ہے، اور حرف ڈی (D) کا انگریزی میں آنا تو انگریزوں کے اس خیال کا نتیجہ ہے کہ یہ لفظ لاطینی زبان کے ADMIRABILIS سے ماخوذ ہے۔

انگریزی و فرانسیسی زبان میں کلمہ ARSENAL ہے جس کی اصل امیر البحر ہے، اس میں تحریف کی گئی اور لفظ بحر کو نکال دیا گیا تو امیرال ہوا، فرانسیسی زبان میں یہی لفظ AMIRAL اور حرف (D) ڈی کا انگریزی میں آنا تو انگریزوں کے اس خیال کا نتیجہ ہے یہ لفظ ,,لاطینی زبان کے ADMIRAL BILIS سے ماخوذ ہے، انگریزی اور فرانسیسی زبان میں ARSENAL اور اطالوی زبان میں ARSENALE اور اسپینی زبان میں ATARAZANA آتا ہے، جس کا مفہوم اسلحہ خانہ (میگزین) اور ,,کشتیوں کے تیار کرنے کی جگہ،، ہے۔ اس کی اصل عربی ,,دار الصناعۃ،، ہے۔ ہم نے یہ عربی کلمہ ترسانہ (میگزین)

کی شکل میں اختیار کیا، جو اسپینی زبان سے محرف ہوا ہے اس سلسلہ کا ایک لفظ انگریزی فرانسیسی اور اسپینی زبان میں CABLE ہے اس کا معنی مضبوط اور موٹی رسّی ہے، جس سے کشتیوں کے باندھنے کا کام لیا جاتا ہے، اس کلمہ کی اصل الحبل ہے مگر افسوس کہ ہم نے ان اجنبی زبانوں سے یہ کلمہ مستعار لیا اور کیبل کہنا شروع کر دیا۔

الملابس۔ لباس:۔

لباس کے ساتھ جو الفاظ خاص ہیں ان میں ایک لفظ انگریزی میں COTTON ہے جو القطن سے بنا ہے۔ اسپینی لوگ اس کو ALGODON کہتے ہیں جو عربی کے القطن سے قریب ہے، جرمن نے تو عربی لفظ نہیں لیا، بلکہ اس کو BAUMWOLLE کہا۔

ایسے ہی ایک لفظ انگریزی زبان میں MUSLIN ہے جو روئی کا باریک بنا ہوا ایک قسم کا کپڑا ہے اس لفظ کی اصل موصلی ہے کیونکہ وہ موصل سے لایا جاتا تھا۔

ایک لفظ TABBY انگریزی میں آتا ہے۔ کھردرے ریشم سے بنا ہوا ایک قسم کا کپڑا ہے بغداد میں قبیلہ عتابی کی نسبت سے یہ نام رکھ دیا گیا ہے ان میں سے ایک لفظ JUBE ہے، فرانسیسی زبان میں جو ایک قسم کا زنانہ لباس ہے اور یہ عربی لفظ الجبہ سے بدلا ہوا ہے۔

وسائل الترفیہ:۔

وسائل ترفیہ کے قبیل سے انگریزی میں لفظ LUTE ہے، فرانسیسی زبان میں LUTH، اسپینی زبان میں LAUD اور اطالوی اور جرمنی زبان میں LIUTO، LAUTE آتا ہے، اصلاً یہ لفظ عود ہے (معازف) باجا، سارنگی۔

ایسے ہی CHESS انگریزی زبان میں شطرنج کے لیے بولتے ہیں جو فرانسیسی اور اطالوی زبان میں ESCHECS، SCACCHI ہے، یہ الفاظ شطرنج سے محرف نہیں ہے بلکہ کلمہ "شاہ" سے ماخوذ ہیں جو شطرنج کی ایک اصطلاح ہے۔ اور جرمنی لفظ SCHACH عربی سے قریب ہے شطرنج ایک اصطلاح انگریزی میں CHECK MATE ہے جس کی اصل الشاہ مات ہے۔ اس لفظ سے مختلف معانی کے لیے الفاظ ہیں۔ ایک تو بینک کی دستاویز کے لیے CHEGUE کا لفظ

ہے جدید عربی میں یہ لفظ سیٹ کہا جانے لگا۔

آخر میں ان الفاظ میں سے ایک لفظ انگریزی زبان میں COFFEE، فرانسیسی اور اسپینی زبان میں CAFE اور اطالوی زبان میں CAFFEE کا لفظ آتا ہے، اور سب کا مرجع عربی زبان کا قہوہ ہے۔

قہوہ کا لفظ آیا تو ایک لفظ "السکر" بھی ملاحظہ فرمائیے کہ لفظ "السکر" یورپ کی ساری زبانوں میں عربی ہی سے آیا ہے۔ چنانچہ انگریزی میں اس کو SUGAR کہتے ہیں اور فرانسیسی و اطالوی زبان میں SULRE، ZUCCHERO بولا جاتا ہے اور عربی لفظ سے زیادہ قریب اسپینی AZUCAR ہے۔ اسی شیریں کلمہ کے ساتھ گفتگو ختم کی جارہی ہے، اللہ تعالی سے دعا ودرخواست ہے کہ ہمارا گذشتہ علمی مجد وتفوق بحال فرمائیں۔ آمین اِنَّہٗ سَمِیْعٌ مُجِیْبٌ۔

اعجاز احمد

ہندوستان اور عربی نعت گوئی

ہندوستانیوں کے لیے عربی ایک بدیسی زبان ہے، انھوں نے اسے کب سے سیکھنا شروع کیا، اس کی صحیح تعیین قدرے مشکل ہے۔ یہ حقیقت ماضی کے دھندلکوں میں روپوش ہے، ہاں یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ عرب و ہند کے روابط بہت قدیم زمانہ سے ہیں اسلام سے کہیں پہلے کے، ان کے یہ تعلّقات تجارتی تھے، عرب و ہند کے باشندے ایک دوسرے کے ملک جاتے، مادی لین دین کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان تہذیبی و ثقافتی اُخذ و عطا بھی ہوتا، اس طرح انھوں نے مافی الضمیر ادا کرنے کے لیے ایک دوسرے کی زبان سے کچھ نہ کچھ ضرور سیکھا۔

درحقیقت ہندوستان پر عربی کی عمیق و عریض ضوفشانیاں اور تابانیاں، صحیح معنوں میں طلوعِ اسلام کے بعد دوسری صدی ہجری میں نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہیں، اہلِ عرب سندھ آئے، دینی و علمی اور سیاسی بالادستی کا ثبوت دیا، کم و بیش دو سو سال تک وہاں کا نظم و نسق ان کے ہاتھوں میں رہا، حکمراں طبقہ اور امراء و عاملین عربی بولتے۔[1] سندھی عوام کی بول چال میں رہی لیکن عربی کے اثرات مقامی زبان پر تیزی سے بڑھتے رہے۔

چوتھی صدی ہجری کی ابتدا میں دیلمیوں کی ہندوستان میں آمد اور سندھ سے عربوں کے اقتدار کے خاتمہ کے بعد فطری طور پر عربی کے چلن میں کمی آئی، رفتہ رفتہ فارسی نے اس کی جگہ لے لی، عربی مسلمانوں کی صرف دینی و مذہبی زبان کی حیثیت سے باقی رہی، قرآن و حدیث اور دیگر علوم اسلامی

---

[1] تاریخ سندھ حصّہ اوّل ص ۳۶۵

کے براہ راست افہام وتفہیم اور تعلیم وتعلم کے لیے اس کا جاننا ضروری تھا۔

علماءِ دین متین اور فقہائے ملّت کی جدوجہد سے عربی زبان رفتہ رفتہ اس برصغیر کے دوسرے علاقوں میں پہنچی، ملتان کے بعد لاہور اور دلّی میں یکے بعد دیگرے اسلامی مراکز قائم ہوئے، دین و دانش کی محفلیں آراستہ ہوئیں۔ شاہانِ ہند کی معارف پروری نے سہارا دیا اور دور دراز مقامات سے جلیل القدر علماء وفضلاء ہندوستان آئے یہاں کی دینی وعلمی تحریک میں حصّہ لیا اور یہیں متوطن ہوگئے، عربی جاننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا، عربی زبان وادب سے شغف بڑھا اور شعر وشاعری سے دلچسپی پیدا ہوئی۔

عربی کے ماہرین یہی علماءِ دین تھے، اُن کی تربیت وتعلیم پاکیزہ ماحول میں ہوئی تھی، دنیا سے کم آمیزی اور حُبّ رسولؐ سے وابستگی ان کا طرۂ امتیاز تھا، شعر وشاعری میں ہرزہ سرائی سے اجتناب کرتے، اپنے فطری وصالح جذبات کی تسکین کے لیے حمد باری تعالیٰ اور مدح وثناءِ رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم میں نغمہ سرا ہوتے۔

نعت گوئی تمام اصنافِ شاعری سے مشکل ہے، یہ راہ شاعری کی سخت ترین راہوں میں ہے، اس پر قدم رکھنا سخت آزمائش کی منزل سے گزرنا ہے:

عرفی مشتاب، ایں رہ نعت است نہ صحرا است
آہستہ کہ رہ بردم تیغ است قدم را

چنانچہ ہندوستان کے عربی نعت گو شعراء نے اس میدان میں پھونک پھونک کے قدم رکھنے کی کوشش کی، ادب واحترام کا پورا پورا لحاظ رکھا، سوقیانہ مضامین اور عامیانہ طرز بیان سے مجتنب رہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ ابتدائی دور میں، شعراءِ قدیم کی روایتی تقلید وپیروی میں عشقیہ تشبیب کا التزام کیا، عرب شعراء کی طرح وہی دیارِ حبیب کے کھنڈرات پر آہ وبکا، فراق کے کچوکوں، محرومئ وصل کے شکووں اور غزالانِ عرب کے حسن وجمال کے تذکروں سے اپنے نعتیہ قصائد کی ابتدا کرتے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کے اس رجحان میں تبدیلی آئی، تشبیب میں فرضی افکار وخیالات اور مبتذل مضامین سے علاحدگی اختیار کی یہاں تک کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ قصیدہ کی تشبیب میں عورتوں کے حسن وجمال اور ان کے خدوخال کا تذکرہ کیا جائے، وہ ببانگ دہل اعلان

فرماتے ہیں:۔

وان بینت فی المنظوم وجداً　　فحاشا أن تشبب بالنساء
فتلک شرائع للشعر قدماً　　وقد نسخت بختم الأنبیاء[1]

ہوسکتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کے سامنے شیخ زین الدین ابن الوردی المعری (۱۳۴۸-۱۲۸۹ء) کا قصیدۂ لامیہ ہو جس میں یادہ گوئی اور عشقیہ تشبیب سے گریز کا مشورہ دیا گیا ہے۔

اعتزل ذکری الأغانی والغزل　　وقل الفصل وجانب من ھزل
ودع الذکری لأیام الصبا　　فلأیام الصبا نجم أفل

ہندوستان کی عربی نعت گوئی کے ارتقائی مراحل میں ایک اور پیش رفت ہوتی ہے، مقامی رنگ کی آمیزش سے قصیدہ کی تکنیک اور تراش خراش اثر پذیر ہوئی اور اس کی وسعتوں میں اضافہ ہوا، آزاد بلگرامی نے عربی کے اپنے قصائد میں ہندی کے صنائع و بدائع سے کام لیا، ان کا بیان ہے کہ ۱۴ صنائع ہندی سے مستعار لیں اور ۲۰ طبع زاد ہیں[2]۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ایک طویل قصیدہ بائیہ ایک سو ایک اشعار کا نظم کیا جو تکرار قوافی سے بالکل پاک ہے، اس میں ہندی کے صنائع و بدائع کی مثالیں پیش کی ہیں، قصیدہ کے تمہیدی اشعار میں عربی کے ان قدیم ادباء و شعراء کے نام گنائے ہیں جن کی تقلید انھوں نے شاعری کی اس مخصوص صنف میں کی ہے، تمہید کا تتمہ وہ اس طرح پیش کرتے ہیں:۔

نظمت قصیدۃ غراء فیھا　　صنائع کاملات فی البھاء
تعالوا واسمعوا ملح الأغانی　　عن الورقاء ثم الکوکلاء[3]

آزاد کے یہاں مقامی رنگ کی شوخی اور چوکھا پن یہاں تک غالب آگیا کہ علامہ شبلی اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہ رہ سکے کہ "ان کے کلام میں اس قدر عجمیت ہے کہ اس کو عربی کہنا مشکل ہے"[4]۔

عربی کی نعتیہ شاعری میں یہاں کے ادباء نے اہلِ زبان شعراء کے مشہور قصیدوں کے طرز

---

[1] اطیب النغم ص ۲۹　[2] تفصیل کے لیے دیکھیں سبحۃ المرجان ص ۱۳۵　[3] سبحۃ المرجان ص ۲۲۰
[4] مقالات شبلی حصۂ پنجم ص ۱۲۹

پر ان کے متوازی قصیدے لکھے، اور اس کوشش میں انھیں ایک حد تک کامیابی بھی نصیب ہوئی، کعب بن زہیر (م ۲۴ھ) کا بانت سعاد، مؤید الدین الطغرائی (۱۱۲۱-۱۰۶۱ء) کا لامیۃ العجم اور شرف الدین البوصیری (۱۲۱۳-۱۲۹۵ء) کا قصیدۃ البردۃ، ادب عربی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، ہندوستان کے شعراء نے ان کی تقلید میں متعدد لامیے لکھے، قاضی عبدالمقتدر، غلام علی آزاد اور رضا حسن خاں کے لامیۃ الہند، طغرائی کے لامیۃ العجم کے مقابلہ میں پیش کیے جا سکتے ہیں، شاہ ولی اللہ کا بائیہ حضرت سواد بن قارب صحابئ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز پر ہے اور رضا حسن خاں کا انموذالکمال قصیدۂ بردہ کے انداز پر۔

تقدم زمانہ کے ساتھ ساتھ نعت گوئی کا یہ قافلہ بھی آگے بڑھا، ہندوستان کے طول وعرض سے مشتاقان سفر اور یاران تیز گام، رواں دواں نظر آئے، وافر مقدار میں زادراہ اکٹھا ہوا اور منزل بہ منزل پیش قدمی ہوتی رہی۔

زمانہ نے ایک اور کروٹ لی، ہندوستان میں اسلامی علوم وفنون اور عربی زبان وادب تیزی سے نشوونما پا رہے ہیں، عہد حاضر کی صنعتی اور مشینی سہولتوں، رسل ورسائل کے ترقی یافتہ اور تیز رفتار وسائل، آمدورفت، اور درآمد وبرآمد کی آسانیوں، ریڈیو، صحافت اور ابلاغ وتبلیغ کے دیگر ذرائع اور مجاہدین ملت کی سرگرم کوششوں نے اس مقصد عظیم کو مزید تقویت پہنچائی، ہندوستانیوں کی عربی زبان منجھتی جا رہی ہے، سلاست وروانی اور پاکیزگی میں اضافہ ہو رہا ہے، نعت گوئی بھی، قدرتی طور پر اس سے فروغ وجلا پا رہی ہے۔

کم وبیش یہ ہیں ہندوستان میں عربی نعت گوئی کے تخلیقی اسباب وعوامل، اس کے ارتقائی مراحل اور امتیازی خصوصیات۔

نعت گوئی کے اس سرسری جائزہ کے بعد اب میں اجازت چاہتا ہوں کہ اپنے ملک کے مادحین پیمبر اور نعت گویان رسول صلے اللہ علیہ وسلم میں سے چند کے فن وشخصیت پر قدرے تفصیلی روشنی ڈالوں جو اپنی جگہ پر بلند وقد آور، صاحب طرز اور اپنے عہد کے نمائندہ شاعر سمجھے جاتے ہیں۔

قاضی عبدالمقتدر (متوفی ۷۹۱ھ)

سرزمین ہند میں غالباً وہ پہلا شاعر جو ہمیں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی عربی نعت گوئی میں مصروف اور ان کی مدح وثناء میں نغمہ سرا دکھائی دیتا ہے، وہ ہیں قاضی عبدالمقتدر التھانیسری ثم الدھلوی، یہ مداح رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اپنے عہد کے جید ہندوستانی علماء اور دانشوروں میں ممتاز مقام کے مالک تھے، ان کے جدامجد قاضی سلیمان جو مشہور قاضی شریح الکندی کی نسل سے تھے وہ قطب الدین مبارک خلجی (مقتول ۱۳۲۱ء) کے عہد میں ہندوستان آئے اور ملک کے شمالی علاقہ کے قاضی مقرر ہوئے، اس طرح انھوں نے تھانیسر میں مستقل بود وباش اختیار کرلی[1]

قاضی عبدالمقتدر تھانیسر میں پیدا ہوئے لیکن اُن کی تعلیم وتربیت دلی میں ہوئی، صحیح تاریخ پیدائش کسی تذکرہ میں نہیں ملتی ہے اُخبار الأخیار کے مصنف مولانا عبدالحق حقی نے اُن کی وفات کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ جس وقت اُن کا انتقال ۲۶ رمحرم ۷۹۱ھ کو ہوا وہ اٹھاسی سال کے تھے[2] اس طرح ہم قیاساً کہہ سکتے ہیں کہ وہ ۷۰۳ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

قاضی صاحب نے اس زمانہ کے رسم ورواج کے مطابق اسلامی علوم وفنون کی تعلیم حاصل کی، ان کے نامور اساتذہ میں مشہور صوفیا وشیوخ شمس الدین محمد بن یحیٰی اور ناصرالدین محمود معروف بہ روشن چراغ دہلوی کے نام نامی اور اسماء گرامی ملتے ہیں۔ قاضی صاحب نے دینی علوم کے ساتھ ساتھ عربی زبان وادب کی طرف بھی پوری توجہ رکھی۔ وہ حقیقتاً دین وشریعت کے ایک ممتاز عالم اور عربی زبان وادب کے ایک فائق ورائق ادیب تھے، انھوں نے عربی میں فصیح وبلیغ مدحیہ قصائد اور حسین وجمیل تشبیہیں لکھیں، ان کا وہ قصیدہ جو انھوں نے مویدالدین الطغرائی الاصفہانی (م ۱۱۲۱-۱۰۶۱ء) کے مشہور ومعروف لامیۃ العجم کے مقابلہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح وثناء میں لکھا ہے بہت ہی مشہور ہوا، کہا جاتا ہے کہ ان کا یہ لامیۃ الہند بہت طویل تھا، بعض علماء ومشائخ نے اس کی شرحیں لکھی ہیں[3] بظاہر پورا قصیدہ اب کہیں دستیاب نہیں ہے، صاحب اخبار الاخیار نے

---

[1] نزہتہ الخواطر حصّہ دوم ص ۱۷، [2] اخبار الاخیار ص ۱۵۱۔ [3] صدیق حسن۔ ابجد العلوم ص ۸۹۲

اس کے ۲۵ شعر نقل کیے ہیں جن میں سے بیسؔ تشبیب پر مشتمل ہیں اور پانچ مدح وثنا سے تعلق رکھتے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ یقیناً طویل ہوگا، اس لیے کہ جس قصیدہ کی تشبیب میں بیسؔ بتیس نظم کی گئی ہوں اس کے اصل موضوع پر ضرور اس سے کہیں زیادہ اشعار ہوں گے، چنانچہ میر غلام علی آزاد نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف سبحۃ المرجان میں قاضی صاحب کے بارہ میں یہ کہتے ہوئے:

وللقاضی قصیدۃ لامیۃ طویلۃ، أنقل هنا اکثرها واترك أقلها۔[1]

انچاس شعر نقل کیے ہیں۔

قاضی صاحب کے لامیۃ سے ان کی قادر الکلامی، شاعرانہ صلاحیت، وسعت تخیل اور معنی آفرینی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، ڈاکٹر زبید احمد مرحوم اپنی کتاب Contribution of India To Arabic Literature میں اس قصیدہ کی تعریف وتحسین میں یوں رقم طراز ہیں:۔

It is admired for the elegance of its style the beauty of the introductory lines the approprateness of the matchless and the fertility of imaginetion.

قصیدہ کی تشبیب کے چند بیت سماعت فرمائیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ واقعۃً کوئی اعرابی اپنی محبوبہ کے اس جائے قیام پر اتفاقاً آپہنچا ہے جسے چھوڑ کر وہ اور اس کا قافلہ رخصت ہو چکے ہیں، اعرابی کو ماضی کی یادیں ستا رہی ہیں، وہ اُن پر بے تحاشا آنسو بہائے چلا جا رہا ہے، اور دل وجگر کے خون آلود ٹکڑے بطور نذرانہ پیش کر رہا ہے:

یاسائق الظعن فی الاسحا والأصل	سلم علی دار سلمی وابك ثم سل
عن الظباء التی من دابها أبدًا	صید الاسود بحسن الدل والنجل
وعن ملوك کرام قد مضوا قدمًا	حتی یجیبك عنهم شاهد الطلل

---

[1] سبحۃ المرجان ص ۳۰ [2] ص ۲۰۷

أضحت إذا بعدت عنها كواعبها | اطلا لها مثل اجفان بلا مقل
فذى فوادى أعرابية سكنت | بيتا من القلب معموراً بلا حول
بخيلة بوصال المستهام بها | والجود فى الخود مثل البخل فى الرجل [1]

چند نعتیہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔

محمد خير خلق الله قاطبة | هو الذى جل عن مثل وعن مثل
له المزايا بلا نقص ولا شبه | له العطايا بلا من ولا بدل
له المكارم انجى من نجوم دجى | له العزائم أمضى من قنا البطل
له الجمال إذا ما الشمس قد نظرت | اليه قالت ألا يا ليت ذلك لى
النصر قادمه والفتح خادمه | كلاهما عن حماه غير مرتحل
يا أعظم الناس من حاج ومعتمر | وأكرم الخلق من حاف ومنتعل
أتيتنا بكتاب جل منفعة | وجئتنا بسبيل ناسخ السبل
بعثت بالملة البيضاء راسخة | عفا بها سائر الأديان والملل

شیخ احمد تھانیسری (متوفی ۸۲۰ھ)

قاضی عبد المقتدر کے ذہین و باذوق تلامذہ میں ایک عزیز شاگرد شیخ احمد تھانیسری تھے اپنے استاد کی طرح شیخ صاحب بھی تھانیسر میں پیدا ہوئے اور تعلیم و تربیت دلی میں پائی، قاضی صاحب جیسے متبحر عالم کے سایۂ عاطفت میں رہ کر عربی زبان و ادب کا مذاق سلیم اور علوم دینی سے گہری واقفیت پیدا کی۔

شیخ صاحب کی زندگی کا ایک واقعہ ان کی اعلیٰ ذہانت اور روحانی عظمت کی شہادت کے لیے کافی ہے۔ ۸۰۱ھ میں امیر تیمور نے دہلی کو اپنی غارت گری کا نشانہ بنایا، اس کے سپاہیوں نے

---

[1] سبحة المرجان ص ۳۰

منجملہ دوسروں کے شیخ صاحب کے خاندان والوں کو بھی قید کرلیا۔ دہلی کا ہنگامہ جب فرو ہوا اور تیمور کو شیخ صاحب کی علمی عظمت اور روحانی منزلت کا علم ہوا تو اس نے بلا تأمل شیخ صاحب کے خاندان والوں کو رہا کر دیا اور ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، ملاقات ہونے پر اس نے انھیں بعینہٖ ویسا ہی پایا جیسا کہ اسے بتایا گیا تھا۔ شیخ موصوف کو اپنے مصاحبین میں داخل کرلیا اور بہت ہی عزّت واحترام سے پیش آیا، یہاں تک کہ جب وہ ہندوستان سے رخصت ہونے لگا تو انھیں اپنے ساتھ سمرقند لے جانے کی پیش کش کی لیکن شیخ صاحب کسی طرح اپنا وطن چھوڑنے کے لیے راضی نہ ہوئے۔

ہندوستان سے تیمور کے چلے جانے کے بعد، دلی کے حالات بدلے اور شہر کی رونق اور چمک دمک میں کمی آگئی، شیخ صاحب مع اپنے خاندان کے کالپی چلے آئے، یہاں انھوں نے اپنی بقیہ زندگی درس وتدریس اور زہد وعبادت میں گزاری، تاآنکہ ۸۲۰ھ میں تقریبًا اسّی سال کی عمر میں وفات پائی، اور اندرون قلعہ مدفون ہوئے[1]

شیخ احمد تھانیسری اپنے عہد کے ایک ممتاز عالم دین اور قادر الکلام شاعر تھے، میر غلام علی آزاد جیسے شاعر وناقد نے حسب ذیل لفظوں میں ان کو خراج عقیدت پیش کیا ہے:

"ھو عالم یشبہ اللآلی تحریرہ وشاعر یحکی السلسال تقریرہ"

کہا جاتا ہے کہ شیخ موصوف کی عربی نظمیں اور قصیدے کافی تعداد میں تھے لیکن اپنے استاد قاضی عبد المقتدر کی طرح ان کے کلام کا بھی اکثر حصّہ مرور زمانہ کے ہاتھوں تلف ہوگیا، اور اب اس کا بظاہر کوئی نشان نہیں ملتا، مختلف سوانح نویسوں نے ایک مدحیہ قصیدہ کے کچھ اشعار نقل کیے ہیں جو دالیہ کے نام سے معروف ومشہور ہے۔ صاحب اخبار الاخیار نے اکتالیس اور مؤلف سبحۃ المرجان نے انیس[2] شعر دیئے ہیں۔

آپ حضرات بھی ان میں سے چند اشعار سنیں اور لطف اندوز ہوں۔

أطار لبی حنین الطائر الغرد   وهاج لوعة قلبی التائه الکمد

---

[1] نزہۃ الخواطر حصّہ سوم ص ۱۳ ۔ [2] سبحۃ المرجان ص ۳۸

واذکرتنی عهودًا بالحمی سلفت | حمامة صدحت من لاعج الکبد
بانت تؤرقنی والقوم قد هجعوا | مابین مضطجع منهم ومستند

. . . .

کأنه لم یکن بین الحمی أنیس | إلی اللوی وکان الحی لم تفد
لاعیش بعد لسُیلات اللوی رغداً | ولاوصول إلی ذالك الحمی بیدی
خل الأحادیث عن لیلی وجارتها | وارحل إلی السید المختار من ادد
محمد احمد الهادی لأمته | إلی الصراط، صراط غیر ملتحد
بر، رؤف، رحیم سید سند | سهل الفناء، رحیب الباع والعضد
أفدیك بالروح والقلب المشوق معاً | والنفس والمال والأهلین والولد
قد عاقنی البعد عن مرمی أؤمله | وطال شوقی إلی لقیاک یا سندی
أرجوالوفادة فی أرض حللت بها | یالهف نفسی إذا ماکنت لم أفد[1]

اس قصیدہ سے شیخ احمد تھانیسری کی شاعرانہ قوتِ اظہار، قابل تحسین قادرالکلامی اور تشبیب سے اصل موضوع یعنی رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی مدح وثنا کی جانب خوبصورت اور ماہرانہ گریز ـــــ یہ سارے اوصاف حمیدہ ایک باذوق وصاحب دل قاری پر اچھی طرح منکشف ہوجاتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ (۱۱۷۶-۱۱۱۴ھ)

قطب الدین احمد معروف بہ شاہ ولی اللہؒ کی ولادت باسعادت ۴ شوال ۱۱۱۴ھ کو بروز چہارشنبہ دلّی میں ہوئی، تعلیم زیادہ تر، اپنے والد محترم شیخ عبدالرحیم صاحب سے حاصل کی، پندرہ سال کی عمر میں علوم متداولہ سے فراغت کرکے اپنے والد بزرگوار کے مدرسۂ رحیمیہ میں تدریس شروع کی، دوسال کے بعد باپ کا سایہ عاطفت جاتا رہا، مدرسہ کی پوری ذمہ داری شاہ صاحب کے کاندھوں پر آئی،

---

[1] سبحۃ المرجان ص ۳۸، ۳۹

انھوں نے تقریبًا بارہ سال تک یہ تدریسی سلسلہ جاری رکھا۔

۱۱۴۳ھ میں حج کے لیے روانہ ہوئے، دو سال سرزمینِ حجاز میں قیام کرکے ۱۱۴۵ھ میں ہندوستان واپسی ہوئی، شاہ صاحب نے وہاں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے جلیل القدر علماء سے اپنی علم کی پیاس بجھائی، عربی کی تقریر و تحریر میں جلا پیدا کی اور دینی و علمی تبحر میں اضافہ کیا۔

شاہ صاحب کو شروع ہی سے زبان و ادب سے گہری دلچسپی رہی، قدیم شعراء کے کلام کا معتدبہ حصہ زبانی یاد تھا، وہ اپنے مواعظ و خطب اور علمی و دینی مباحث میں اشعار سنایا کرتے[۱] جتنا شغف انھیں دینی علوم سے تھا کم و بیش اتنا ہی لگاؤ انھیں زبان و ادب سے بھی تھا، وہ اس شاخ علم کی اہمیت و عظمت اپنے بچوں کے دلوں میں بٹھانے کی کوشش کیا کرتے[۲]

حضرت شاہ صاحب ایک جلیل القدر عالم اور خوش فکر شاعر تھے، عربی و فارسی دونوں ہی زبانوں میں ان کی قادر الکلامی قابلِ تحسین و آفریں تھی، شعر گوئی اور شعر فہمی کا اعلیٰ اور صالح مذاق انھیں فطری طور پر ودیعت ہوا تھا، وہ ہندوستان کے ان چند علماء میں شمار کیے جاتے ہیں جن کی عربی واقعۃً فصیح و پاکیزہ اور ادبا ءِ عرب کے معیار پر پوری اترتی ہے۔ غالبًا وہ پہلے ہندوستانی مصنف ہیں جن کی عربی تصنیفات میں وہی زور و قوت اور وہی روانی و برجستگی پائی جاتی ہے جو اہلِ زبان انشاء پردازوں کی خصوصیت ہے، شاہ صاحب کی عربی تحریریں اُن خامیوں سے یکسر پاک و صاف ہیں جو غیر عرب مصنفین میں عام طور پر پائی جاتی ہیں[۳]

شاہ صاحب عربی و فارسی دونوں ہی زبانوں کے قادر الکلام شاعر تھے، فارسی غزلوں میں کبھی کبھی ان کا تخلّص امین ملتا ہے۔ انھوں نے مختلف اصنافِ سخن، غزل، قصیدہ اور رباعی وغیرہ پر طبع آزمائی فرمائی اور امتیازی شان سے باحسن وجوہ عہدہ برا ہوئے، کچھ کتابوں پر تقریظیں نظم کی شکل میں لکھیں اور کچھ خطوط کے جوابات بھی نظم ہی میں دیئے، وہ ایک اچھے خاصے قیمتی ذخیرۂ شعری کے مالک

---

[۱] رحیم بخش ۔ حیات ولی ص ۲۶۵، [۲] سید ناصر نذیر فراق دہلوی ۔ لال قلعہ کی ایک جھلک ص ۶۳

[۳] مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۔ الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر ص ۳۶۶ (۱۳۶۰ھ)

ہیں جس سے اُن کی وسعتِ تخیل، زبان و بیان کی پختگی اور ان کے شاعرانہ ملکہ کی صحیح اور سچی تصویر ایک ناقدفن کے سامنے ابھر کر سامنے آتی ہے۔ حیات ولی کے مصنف نے شاہ صاحب کی فارسی غزلیں اور رباعیاں (مجموعی طور سے کل ۴۸ شعر) نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شاہ صاحب کے شاعرانہ کلام کی تھوڑی سی جستجو کرنے پر ایک چھوٹا موٹا مجموعہ آسانی سے مرتب ہو سکتا ہے[۱]۔

اسی ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں جہاں ہم سب آج مذاکرۂ علمی میں شرکت کے لیے حاضر ہوئے ہیں ایک قیمتی مخطوطہ بعنوان "دیوان شاہ ولی اللہ" موجود ہے، اس میں مجموعی طور پر ۱۸۱ صفحے ہیں، اس تعداد میں وہ صفحات بھی شامل ہیں جن پر صفحہ کا ہندسہ مرقوم نہیں، دیوان کے ہر صفحہ پر کم و بیش نو سطریں ہیں، جامع دیوان کا نام نامی اسحاق بن محمد عرفان رائے بریلوی (متوفی ۱۲۴۴ھ) اور کاتب کا نام سید قربان محی الدین حیدر آبادی تحریر ہیں، یہ دیوان شاہ صاحب کا مکمل مجموعہ سمجھا جا سکتا ہے اس لیے کہ فارسی کے کچھ اشعار کو چھوڑ کر اس مخطوطہ میں شاہ صاحب کا غالباً سارا کلام اکٹھا کر دیا گیا ہے حتیٰ کہ ان کے وہ چار قصیدے بھی شامل ہیں جو مراد آباد سے ۱۳۰۴ھ میں بعنوان "اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم" زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں لیکن یہ مطبوعہ قصیدے اس قلمی دیوان میں علاحدہ نقل نہیں کیے گئے ہیں بلکہ شاہ صاحب کے فرزندانِ گرامی شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین رحمہما اللہ کی تخمیسات کے ضمن میں ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ کا کلام فارسی ہو یا عربی عام طور سے وہ صوفیانہ تصورات و مشاہدات، اللہ تعالیٰ کی محبت و وحدانیت، اس کے صفات حسنہ کی عظمت و جلالت اور اسرار و رموز سے مملو نظر آتا ہے، وہ سوقیانہ مضامین اور عامیانہ طرز بیان سے یکسر اجتناب کرتے، ان کے یہاں اخلاقی و اصلاحی پہلو نمایاں ہے۔

شاہ صاحب کا مشہور قصیدہ "اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم" اچھا خاصا طویل ہے، اس میں ایک سو چھ شعر ہیں، یہ قصیدہ انھوں نے حضرت سواد بن قارب صحابی رسول ؐ کے

---

[۱] ص ۲۷۹

بائیہ کے طرز پر کہا ہے اس کے چند شعر سماعت فرمائیں جو شاہ صاحب موصوف کے شعری خصوصیات کے واقعی حامل و آئینہ دار ہیں۔

کأن نجومًا أومضت فی الغیاھب | عیون الأفاعی أو رؤوس العقارب
إذا کان قلب المرء فی الأمر خائرًا | فأضیق من تسعیف رحب السباسب
وتشغلنی عنی وعن کل راحتی | مصائب تقفو مثلها من مصائب
إذا ما أتتنی أزمة مدلهمة | تحیط بنفسی من جمیع الجوانب
تطلبت هل من ناصر أو مساعد | أعوذ به من خوف سوء العواقب
فلست أری إلا الحبیب محمدًا | رسول إله الخلق جم المناقب
ومعتصم المکروب فی کل غمرة | ومنتجع الغفران من کل تائب [1]

سید غلام علی آزاد بلگرامی (۱۱۱۶-۱۲۰۰ھ)

سید غلام علی آزاد ابن سید نوح ۲۵ رصفر ۱۱۱۶ھ بروز یکشنبہ، ہردوئی کے مشہور و مردم خیز قصبہ بلگرام میں پیدا ہوئے، سارے خاندان میں دینی علوم و فنون اور زبان و ادب کا چرچہ تھا، ان کے نانا سید عبد الجلیل اور ماموں سید محمد قصبہ کے مؤقر و محترم علماء اور شعراء میں گنے جاتے تھے ایسے ماحول میں سید غلام علی کی تربیت و تعلیم ہوئی، انھوں نے اپنے زمانہ کا مقررہ درسی نصاب شروع سے آخر تک اترولی کے مشہور عالم دین سید محمد طفیل صاحب سے پڑھا، زبان و ادب اور حدیث و سیر اپنے نانا سے اور عروض و قوافی اپنے ماموں سے ۱۱۳۷ھ میں صوفی بزرگ سید لطف اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔

۱۱۵۰ھ میں زیارت حرمین شریفین کے شوق میں گھر سے تن تنہا روانہ ہوئے، سرزمین حجاز پہنچکر شیخ عبد الوہاب طنطاوی مصری اور شیخ محمد حیات سندی رحمہما اللہ سے علمی اور روحانی استفادہ کیا۔

---

[1] اطیب النغم ص ۳-۴

شیخ طنطاوی ان کی شاعری کے مداح تھے، ایک دن شاگرد نے استاد محترم کے سامنے اپنا تخلص آزاد اور اس کا مفہوم بتایا جس پر شیخ موصوف نے برجستہ فرمایا أنت من عتقاء اللہ[1]

تقریباً دو سال بعد اپنے ملک واپس ہوئے، اورنگ آباد (دکن) میں مستقلاً قیام پذیر ہوگئے اور گوشہ نشینی اور عسرت کی زندگی اختیار کی۔ ۱۲۰۰ھ میں ان کی وفات ہوئی اور روضہ خلدآباد میں جو اورنگ آباد سے بارہ میل کے فاصلہ پر ایک شاداب وخوبصورت جگہ تھی مدفون ہوئے۔

سیّد غلام علی آزاد ایک ممتاز ادیب اور مشہور مؤرخ تھے، فارسی وعربی دونوں ہی زبانوں میں ان کی گراں قدر شعری ونثری تصنیفات موجود ہیں، ہندی میں بھی انھیں مہارت تامہ حاصل تھی وہ اس زبان میں بھی شاعری کرتے تھے، سبحۃ المرجان میں اپنے بارہ میں لکھتے ہیں:۔

"ومالی فی الھندی دیوان لکنی ماھر بالشعر الھندی ودقائقہ،

ورائع نظری فی مزجسہ وشقائقہ[2]

لیکن ان کی ہمہ گیر شہرت کا دارومدار ان کی عربی تالیف وتصنیف پر ہے، وہ بجا طور پر عربی زبان کے سب سے بڑے ہندوستانی شاعر مانے جاتے ہیں، ان کے عربی اشعار کی تعداد گیارہ ہزار سے کہیں زائد ہے، عربی تصنیفات میں تسلیۃ الفؤاد، مرآۃ الجمال، سبحۃ المرجان اور مظہر البرکات وغیرہ ہیں، ان کے علاوہ دس مکمل دیوان جن میں سے دو دیوان تین ہزار اشعار پر مشتمل انھوں نے مدینہ منورہ بھیجے تھے، وہاں کے اہل علم نے اُن کی تحسین وآفریں کی اور شاعر کی دلی آرزو کے مطابق گنبدِ خضراء کے مکین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے حضور میں پیش کردیئے۔

شعر گوئی آزاد کے طبعی خمیر میں تھی، وہ اس کا اونچا اور ستھرا ذوق رکھتے تھے، ان کی شاعری محض رسمی وتقلیدی نہ تھی وہ ایک صاحب طرز شاعر تھے، اُن کے افکار وخیالات ان کے ذاتی ادبی رجحان اور مخصوص ذوق وانفرادیت کے سانچے میں ڈھل کر رونما ہوتے تھے، ہندی زبان کے

---

[1] سبحۃ المرجان ص ۱۲۰ -

لفظی و معنوی محاسن اور فارسی کی شیرینی و گہرائی کے سید صاحب بڑے مداح تھے، وہ اپنی عربی میں ان زبانوں کے جمال و جلال کو سمو کر ایک ایسا شاہکار پیش کرنا چاہتے تھے جس میں ہندی کا نمک، فارسی کی مٹھاس اور عربی کی گہرائی، یہ سبھی اوصاف ایک حد تک موجود ہوں انھیں اپنی کوشش میں کامیابی نصیب ہوئی، انھوں نے فارسی کی بحور اور اس کے اصناف شعری، مثنوی، رباعی اور مستزاد کے طرز پر عربی میں اشعار کہے اور ان میں ہندی کے صنائع و بدائع سے کام لیا، اسی لیے اُن کا کلام قدیم کلاسیکی عربی رنگ سے کسی حد تک الگ نظر آتا ہے، بلکہ یہاں کا مقامی رنگ اور اس کی چھاپ زیادہ نمایاں ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ بعض معتبر اور ثقہ ناقدین فن نے یہاں تک کہہ دیا "کلام میں اس قدر عجمیت ہے کہ اس کو عربی کہنا مشکل ہے"[۱]۔ لیکن یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ عرب اہلِ زبان نے ان کے کلام کو سراہا ہے، شیخ احمد الیمنی نے اپنے مشہور مجموعہ نفحۃ الیمن میں ان کا قصیدہ شامل کر کے ان کی عربی کو سند قبولیت دیدی ہے[۲]۔

آزاد کے کلام کا ایک معتد بہ حصہ حضور کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی مدح و ثنا پر مشتمل ہے وہ حسان الہند کہے جاتے ہیں، ان کے نعتیہ قصائد، بندش الفاظ، حرارت جذبات اور ندرت معانی کے آئینہ دار ہیں۔ کسی ہمعصر نے ان کی تحسین حسب ذیل الفاظ میں کی ہے:۔

وهو حسان الهند، مدح النبي صلى الله عليه وسلم في الدواوين السبعة وأوجد في مدحه معاني كثيرة نادرة لم يتيسر مثلها لأحد من الشعراء المفلقين وأبدع في قصائده المدحية مخالص لم يبلغ مداها فرد من الفصحاء المتشدقين[۳]

نمونہ کے طور پر ان کے لامیہ سے جس میں ۵۲ ابیات ہیں چند شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

سبحان من أرّق العشاق في الأزل   وزان ناظرة الغزلان بالكحل

هو الذي جعل الأكباد راضية   بأنهم من ذوات الأعين النجل

---

[۱] مقالات شبلی حصہ پنجم ص ۱۲۹ - [۲] ص ۴۶-۱۱۴ - [۳] سوانحی خاکہ ص ۱۸-۱۹ (مظہر البرکات قلمی)

أصابنی بالعوالی سهم رامیة — شهيرة بمهاة من بنی ثعل
من لی لفاتنة صینت کمقلتها — بمرهقات معرّاة عن الخِلل
مضی زمان لقینا فیه جیرتنا — عفا المهیمن عن أیامنا الأول

نعتیہ اشعار سماعت فرمائیں۔

محمد زینة الأفلاك عنصره — ووشي أردية الأسحار والأُصل
فوق العباد ولعد الرب مرتبة — وجوهرٌ نزه عن وصمة المُثُل

. . . .

أئمة الناس طراً مقتدون به — هذا الجناب المعلی قبلة القبل
تبارك الله بدرٌ لا محاق لهُ — وخاتم فصه نور بلا حِول
لقد رأى الفقر راقبا لانبصرته — حتى غدا غرةً فی جبهة الدول
ارادخیر الوری، زیدت منامبه — إلقاءَ حضرة العلیا من القلل
فالله من صهوة الأفلاك مكّنه — جزاءً ما رامه فی ذروة الجبل
لاغرو ان آخر الخلاق بعثته — هو المقدم فی المعنی علی الرسل[1]

نواب رضا حسن خاں کاکوروی (لکھنؤ) ۱۲۴۶-۱۲۶۶ھ

رضا حسن خاں ۱۳ر ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ جمعرات کے دن کانپور میں پیدا ہوئے، آبائی وطن کاکوری (لکھنؤ) تھا۔ ان کے دادا نواب عاشق علی خاں بہادر (متوفی ۱۲۵۶ھ) بادشاہ اودھ کی جانب سے کلکتہ میں سفیر تھے، اوران کے والد نواب امیر حسن خاں (متوفی ۱۲۶۳ھ) متخلص بہ بسمل بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی کے رفیق (fellow) اس طرح رضا حسن خاں کاکوروی کے معزز ومحترم اور علم وادب سے آراستہ خاندان کے ایک فرد تھے۔ انھوں نے کانپور ہی میں تعلیم حاصل

---

[1] دیوان اوّل

کی اور پندرہ سال کی عمر میں متداول نصاب سے فراغت کرلی۔ اس کے بعد وہ اپنے والد بزرگوار کے پاس کلکتہ چلے گئے، وہاں انھوں نے عربی کے ایک متبحر عالم سید عبدالرزاق صاحب کے زیر نگرانی زبان وادب کا مطالعہ شروع کیا، سید صاحب موصوف نے رضا حسن خاں کی اس سلسلہ میں کافی اعانت کی اور انھوں نے بھی اپنی محنت وکاوش سے عربی زبان پر قدرت اور اس کا مذاق سلیم بہت جلد حاصل کرلیا، پھر تدریس وتالیف میں مشغول ہوگئے، اگرچہ اس وقت ان کی عمر کے سولہ سال بھی پورے نہ ہوئے تھے[1]

۱۹ ربیع الآخر ۱۲۶۶ھ کو کلکتہ میں انتقال ہوا، وہ کم سنی ہی میں اس دنیا سے رخصت ہوگئے عیسوی سنہ تاریخ کے حساب سے بوقت وفات وہ ۱۹ برس سے بھی کم عمر کے تھے لیکن مدح و ثنا کی روشن وتابناک میراث چھوڑ گئے۔

رضا حسن خاں عربی وفارسی دونوں زبانوں کے ایک ذہین وطباع اور زود گو شاعر تھے، رضاؔ تخلص کرتے تھے، عربی کے دو قصیدے ایک انموذج الکمال اور دوسرا لامیۃ الہند مشہور ہیں انموذج الکمال شیخ شرف الدین البوصیری (۱۲۱۳-۱۲۹۵ء) کے مشہور زمانہ قصیدۂ بردہ کے طرز پر کہا گیا ہے اور لامیۃ الہند مؤید الدین الاصفہانی طغرائی (۱۰۶۱-۱۱۲۱ء) کے لامیۃ العجم کے مقابلہ میں ہے، رضاؔ حسن خاں کا لامیۃ الہند اچھا خاصا طویل قصیدہ ہے، وہ ایک سو سولہ ۱۱۶ ابیات پر مشتمل ہے لیکن باوجود اس طوالت کے صرف ایک ہی رات کی فکر کا ثمرہ ہے، اور خوبی یہ ہے کہ قوافی کی تکرار اور مبتذل مضامین سے پاک وصاف، خود شاعر نے لامیۃ الہند کے ان صفات سے متصف ہونے کا دعویٰ اپنے الفاظ میں یوں کیا ہے:۔

وقصیدتی ھذہ سالمۃ من تکرار القوافی وابتذال المضمون ونقص المصاریع فی القوافی وکان عملھا فی لیلۃ واحدۃ من لیالی العشرۃ الأولی لشھر صفر۔

---

[1] تذکرۂ مشاہیر کاکوری ص ۱۶۸ ۔ محمد علی حیدر

یہ قصیدہ ۱۲۶۴ھ میں شاعر کی وفات سے ڈ٘ھائی سال قبل کلکتہ سے شائع ہو چکا تھا، اس کے نسخے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، رضا حسن خاں کا یہ لامیۃ الہندان کی عبقریت، قادر الکلامی اور زود گوئی کا بین ثبوت ہے، نمونہ کے طور پر چند شعر پیش خدمت ہیں:۔

الفقر فی القصر کالغفران فی الزلل　　والعجز فی العز کالکتمان للخلل

إصبر علی مہلکات الدھر مُتلفا　　فالصبر افضل للاتیان بالجذل

الصفو فی العیش کالعنقاء منعدم　　النفس قد جبلت منه علی العزل

فالعیش أقصر من أن تطمئن به　　إن المرارۃ قد حاطت علی العسل

یا لھف کم ساعۃ فی العمر لی تلفت　　والعیش یصحبنا فی ابھج الرفل

طوبی لمن عاش والأفقار موطنه　　والفقر مفخرۃ فی الحال والقبل

محمد افضل الانسان قاطبۃ　　فخر الملائك، زین العقل والرسل

له العطاء بلا نقص ولا خفض　　له السخاء بانواع من المثل

مولانا فیض الحسن ابن علی بخش سہارنپوری (م ۱۳۰۴ھ)

مولانا فیض الحسن نے ابتدائی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں، تکمیل تعلیم کی غرض سے رامپور اور دہلی کا سفر کیا، رامپور میں مولانا فضل حق خیر آبادی اور دوسرے علماء سے اور دہلی میں شیخ احمد سعید بن ابو سعید العمری رحمۃ اللہ علیہ سے علمی اور روحانی فیوض و برکات حاصل کیے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد تدریس شروع کی، عربی زبان و ادب کی تعلیم و تعلم کی جانب ہمیشہ متوجہ رہے، عمر کے آخری زمانہ میں لاہور کے اورینٹل کالج میں عربی کے مدرس مقرر ہوئے، اور غالباً اسی شہر میں ۱۲ جمادی الاولی ۱۳۰۴ھ کو وفات پائی۔

فیض الحسن صاحب ایک ذہین و طباع اور وسیع المطالعہ ادیب تھے، عربی صرف و نحو اور زبان و ادب میں اپنے عہد کے مانے ہوئے سب سے بڑے ہندوستانی عالم تھے۔ مولانا سید عبد الحی مرحوم

جیسے ثقہ مؤرخ نے اپنی مشہور و معروف کتاب نزہۃ الخواطر میں ان کی ذہانت و فطانت اور تبحر علمی کی تحسین حسب ذیل لفظوں میں فرمائی ہے:

كان من أعاجيب الزمان ذكاء وفطنة وعلماً لم يكن في عصره أعلم منه بالنحو واللغة والأشعار وأيام العرب وما يتعلق بها، متوفراً على العلوم الحكمية [۱]

فیض الحسن صاحب کو تصنیف و تالیف سے گہری دلچسپی تھی، ان کی متعدد تصانیف ہیں، وہ اُردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، ان کی ایک طویل اردو مثنوی "صبح عید"، لاہور سے طبع ہو چکی ہے [۲] اس میں کم و بیش چھ سو اشعار ہیں۔ ایک اچھا خاصا دیوان عربی میں موجود ہے یہ ۱۳۲۴ھ میں حیدرآباد (دکن) سے دیوان الفیض کے نام سے شائع ہوا، کم و بیش سولہ سو ابیات پر مشتمل ہے اس میں مختلف اصناف سخن، حمد و ثنا، مدح و ہجو اور فخر و رثاء پر چھوٹی بڑی نظمیں، مختلف اوزان و قوافی میں پائی جاتی ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ثناء میں پورے بارہ قصیدے ہیں، ان کے علاوہ امراء اور والیان ریاست کی شان میں قصائد ہیں، اساتذہ، دوستوں اور عزیزوں پر مرثیے بھی ہیں، کچھ نظمیں روزمرہ کے واقعات و حادثات، بیماری دکھی، گھر کی چوری اور شادی بیاہ سے تعلق رکھتی ہیں تو کچھ میں اپنی جوانی کی یادوں اور بڑھاپے کی نیرنگیوں کا ذکر کیا ہے۔

مولانا فیض الحسن صاحب، بحیثیت شاعر ایک حسین طرز ادا کے مالک ہیں، زبان میں سادگی اور پاکیزگی، اشعار میں ایک خاص روانی و ترنم، جس سے ان کی فنی صلاحیت شعری، قدرت زبان اور معنی آفرینی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

ایک نعتیہ قصیدہ کے متفرق اشعار سماعت فرمائیں:-

يا من يلوذ به الكرام ولا ذوا مالي وراءك ملجأ وملاذ

---

[۱] حصہ ہشتم ص ۳۶۶ [۲] حامد حسن قادری ۔ تاریخ داستان اردو ص ۶۱۱

لا یرتجی جود الغوادی مرتع — من بعد ما اروٰہ منک رذاذ
ما مقصدی من دون طیبۃ بلدۃ — ولوب نفس قصدھا بغداذ
ویل لنفس لم تترک تھاوناً — بل لھا ولمثلھا الفولاذ
طوبیٰ لمن یسعی إلیک ومالھم — ظھر وقد ثقلت لھم أفخاذ
من قال انک میت لا یرتجی — فلیقطعن لسانہ الاستاذ
من لم یلذ بک بات فی تیہ الھوی — ونجا الذین من الھوی بک عاذوا
صلی الالہ علیک خیر وسیلۃ — مادامت الحلال والشذ اذ
أھدی إلیک من الصلوۃ ھدیۃ — فی لیلتین وانتی ھذ اذ

ہندوستان کی تاریخ ادب عربی کی چھان بین کی جائے اور تلاش و تفحص سے کام لیا جائے تو ان بزرگانِ ملّت اور ادبار قوم کی غالباً ایک طویل فہرست مرتب ہو سکتی ہے جنھوں نے اس مخصوص صنف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے، چند نام یہاں بھی پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۔ قاضی عبد المقتدر (م ۷۹۱ھ) — ۲۔ شیخ احمد تھانیسری (م ۸۲۰ھ)
۳۔ شیخ فضیل بن شیخ جلال کالپوی ــــ — ۴۔ شیخ غلام نقشبندی لکھنوی (م ۱۱۲۶ھ)
۵۔ میر عبد الجلیل بلگرامی (م ۱۱۳۸ھ) — ۶۔ قاضی خوب اللہ کاکوروی (م ۱۱۶۱ھ)
۷۔ میر محمد یوسف بلگرامی (م ۱۱۷۲ھ) — ۸۔ حضرت شاہ ولی اللہ (م ۱۱۷۶ھ)
۹۔ سید غلام علی آزاد (م ۱۲۰۰ھ) — ۱۰۔ حبیب عبد اللہ ــــ
۱۱۔ محمد باقر آگاہ مدراسی (م ۱۲۲۰ھ) — ۱۲۔ شاہ عبد العزیز دہلوی (م ۱۲۳۹ھ)
۱۳۔ شاہ رفیع الدین دہلوی (م ۱۲۳۳ھ) — ۱۴۔ اسحاق بن محمد عرفان رائے بریلوی (م ۱۲۳۴ھ)
۱۵۔ قاضی احمد بن مصطفیٰ گوپاموی (م ۱۲۳۴ھ) — ۱۶۔ محمد غوث شرف الملک (م ۱۲۳۸ھ)
۱۷۔ رضا حسن خاں کاکوروی (م ۱۲۶۶ھ) — ۱۸۔ محمد سلیم جونپوری (م ۱۲۶۶ھ)
۱۹۔ احمد بن حسن ابن علی قنوجی (م ۱۲۷۷ھ) — ۲۰۔ فضل حق خیرآبادی (م ۱۲۷۸ھ)
۲۱۔ فیض الحسن سہارنپوری (م ۱۳۰۴ھ) — ۲۲۔ عبد اللہ بلگرامی (م ۱۳۰۵ھ)

مراجع

۱۔ آزاد بلگرامی — سبحۃ المرجان، الدیوان الاوّل (قلمی) مظہر البرکات (قلمی) وغیرہ

۲۔ ابوالحسن علی ندوی — شاہ ولی اللہ بحیثیت مصنف (الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر ۱۹۶۰ء)

۳۔ ابوظفر ندوی — تاریخ سندھ (مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۳۶۶ھ)

۴۔ حامد حسن قادری — داستان تاریخ اردو (عزیزی پریس آگرہ ۱۹۵۷ء)

۵۔ رحیم بخش — حیات ولی (افضل المطابع دہلی ۱۳۱۹ھ)

۶ شبلی نعمانی — مقالات شبلی (مطبع معارف ۱۹۳۶ء)

۷۔ نواب صدیق حسن خاں — ابجد العلوم (المطبعۃ الصدیقیۃ بھوپال ۱۲۹۵ھ)

۸۔ عبدالحق حقی — اخبار الاخیار (مطبع مجتبائی، دہلی ۱۳۳۲ھ)

۹۔ مولانا عبدالحی — نزہۃ الخواطر (مطبوعہ حیدرآباد)

۱۰۔ فیض الحسن — دیوان الفیض (مطبع اختر دکن حیدرآباد ۱۳۳۴ھ)

۱۱۔ محمد علی حیدر — تذکرہ مشاہیر کاکوروی (اصح المطابع لکھنؤ ۱۹۲۷ء)

۱۲۔ شاہ ولی اللہ — اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم دیوان شاہ ولی اللہ (قلمی) (مطبع منشی امجد علی مرادآباد ۱۳۳۵ھ)

۱۳۔ ——— سوانحی خاکہ (عربی) مظہر البرکات (قلمی) کے خاتمہ پر

محمد صلاح الدین عمری
لکچرر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

عربی زبان میں مواعظ کا ارتقاء

ایک جائزہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن کو اوّل تا آخر موعظہ قرار دیا ہے، جو لوگوں کو غلط کاریوں سے روکتا ہے، سود مند نصائح سے مستفید کرتا ہے، اعمال حسنہ کی تعلیم دیتا ہے، انذار و تبشیر کے ذریعہ اللہ کی رضا اور غضب کی راہوں کی نشاندہی کرتا ہے، اور دلوں کے اندر کے جملہ امراض کے لیے نسخہ کیمیا فراہم کرتا ہے، قرآن کے نزدیک "موعظہ" کا اطلاق وعظ، تذکیر، ارشاد، انذار، تبشیر، وعید، قصص انبیاء، درس عبرت گذشتہ اقوام کے عبرتناک واقعات اور احکام نیز تزکیۂ نفس کے عمل میں مفید تمام اسالیب و طرق پر ہوتا ہے اسی وجہ سے قرآن میں لفظ "موعظہ" کا استعمال ان تمام حالات و کوائف، اسالیب اور مفاہیم میں کیا گیا ہے، جو خود قرآن کے موضوعات ہیں، اور ان سب کا مفہوم مشترک "تزکیۂ نفس" ہے، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم و متبعین رسولؐ کو قرآنی مواعظ پر عمل کرنے، ان کی اشاعت کرنے، درس عبرت حاصل کرنے، تبلیغ و دعوت کے میدان میں حکمت و دانائی کو ملحوظ رکھنے اور مہذب و شائستہ اسلوب میں دعوتِ حق دینے کی ہدایت کی گئی ہے[۱]۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلّم نے اپنے قول و عمل کے ذریعہ "موعظہ" کا وہی اسلوب و انداز اپنایا اور اپنانے کا حکم دیا جس کی دعوت قرآن نے دی تھی۔ یعنی سنّت رسولؐ سے "موعظہ" کے قرآنی تصور کی مزید وضاحت و صراحت ہوتی ہے، چنانچہ آپ کا وعظ و نصیحت کے لیے اس خیال

سے کچھ دنوں کا تعین کرنا کہ لوگ اکتانہ جائیں، آپ کا خطبات جمعہ کو طول نہ دینا، مسئلہ کی نوعیت کے مطابق دوران وعظ غضب وغصہ کا بھی اظہار کرنا، جامع انداز میں فصیح وبلیغ اسلوب میں وعظ کہنا، اور لاف زنی، ہرزہ سرائی اور چبا چبا کر گفتگو کرنے پر تنبیہ وغیرہ ایسے نکات ہیں جن کے خطوط پر "موعظہ" کے اسلوب کی تشکیل ہوئی اور قرآن وسنّت کی ہدایات کے مطابق ہی اسلوب عصر خلفائے راشدین میں رائج رہا۔ اس میں انذار وتبشیر، دعوت وتذکیر، قصص انبیاء، قصص اقوام بغرض عبرت، اور علمی وتحقیقی باتیں سبھی کچھ شامل ہوتا، لیکن یہ سب سلیس الفاظ، بے ساختہ عبارتوں، دلوں سے نکل کر دلوں کو چھو لینے والے مؤثر انداز بیان میں ہوتا۔ رنگ آمیزی، یاوہ گوئی، غیر صحیح روایات کا استعمال، غیر علمی باتوں کے بیان، قصہ گوئی، پر تکلف مسجع ومقفیٰ اسلوب کی پابندی، من گھڑت اور موضوع روایتوں سے وعظ کو پراثر بنانے اور الفاظ وعبارات کی تزئین وآرائش وغیرہ جیسی کوششوں کی ہمت افزائی نہ عصر رسولؐ میں کی گئی اور نہ عہد صحابہ وتابعین میں۔ محدثین کرام نے تو جو سخت تحقیقی وتنقیدی موقف اپنایا تھا اس کے سامنے ایسی ساری کوششیں سوقیانہ پن کے مترادف تھیں، چنانچہ ان کے یہاں اس بات کا سختی سے التزام کیا گیا کہ ایسے واعظ راوی سے کسی حدیث کو قبول نہ کیا جائے جو اپنے وعظ میں قرآن وسنّت کی تعلیمات سے تجاوز کرتا ہو۔ ابوطالب مکیؒ (م۔ ۳۸۶ھ) اور ابن الجوزی (م۔ ۵۹۷ھ) نے اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور اس مسئلہ پر صحابہ کرام وتابعین عظام کے طرز پر روشنی ڈالی ہے، قرآن وسنّت کی ہدایات، رسول کریمؐ کے طرز عمل اور پھر صحابہ کرام وتابعین عظام کی جانب سے ان قرآنی ہدایات اور نبیؐ کے اقوال واعمال کی عملی تشریحات وتوضیحات اور اس کی مختلف شکلوں کی وضاحتوں و صراحتوں نیز خود علمائے حق کے طرز ہائے عمل سے "موعظہ" کا ایک واضح، منفرد اور ترقی یافتہ طرز اجاگر ہوا جس میں ضرورت وحالات کے مطابق رفتار زمانہ کے ساتھ دیگر علوم اسلامیہ کے ارتقاء کے پہلو بہ پہلو ارتقا ہوتا رہا۔ اسلامی علوم کا دائرہ وسیع ہوا تو ان کی حد بندیوں میں اس کو بھی ایک مستقل علم کی حیثیت حاصل ہوئی اور پھر اس کی اہمیت وضرورت کے پیش نظر علماء نے اپنی تحریری کاوشوں کے ذریعہ اس کی واضح روپ ریکھا متعین کی۔ کوئی بھی علم جب مستقل شکل اختیار کرتا ہے تو اس کی تعریف، دائرۂ عمل اور مقاصد کی وضاحت وصراحت یا تعیین بھی ضروری ہوتی ہے۔ چنانچہ ابن الجوزی

(م۔ ۵۹۷ھ) نے مواعظ کے اصول و مبادی پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور اس کے اہم و غیر اہم پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ ان اصول و مبادی کی رو سے واعظ کے لیے احکام اسلام کا پابند، عادل، نیک اطوار، خوش خلق، باکردار، باعمل، قرآن فہم، حدیث کا درک رکھنے والا، اسلاف کی تاریخ سے واقف، زبان و بیان کی خوبیوں پر قادر اور مخاطب کی ذہنی سطح کو ملحوظ رکھ کر وعظ کہنے کی صلاحیت ہونا ضروری ہے[۸]۔

ہمارے اس مقالہ کا موضوع، عربی زبان میں مواعظ کے موضوع پر تصنیفی و تالیفی عمل کے ارتقاء کا جائزہ ہے۔ عمومی طور پر خیال یہ ہے کہ ابتداءً وعظ کا جو تصوّر ابھرا اس میں چونکہ کہنے اور سننے کی بات نمایاں تھی اور اسی بنیاد پر ابتدائی دور میں یہ قول تک محدود رہا۔ حالانکہ قرآن و حدیث دونوں سے اس کے مفہوم میں قول، عمل اور کتابت کے پہلو شامل ہیں[۹]۔ لہٰذا اس موضوع پر تصنیف و تالیف کا عمل خاصی تاخیر سے شروع ہوا۔ اس تاخیر کی ایک وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ابتدا میں علوم اسلامیہ کے ارتقائی مراحل میں علوم کی تقسیم و تحدید عمل میں نہیں آئی تھی۔ علوم میں جیسے جیسے وسعت پیدا ہوتی گئی، افکار و نظریات کا ارتقاء ہوتا گیا اور علوم اسلامیہ کے ذخیرہ میں اضافہ ہوتا گیا علوم کی تقسیم و تخصیص عمل میں آتی رہی۔ ہمارا یہ موضوع ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے اولین دور کے بعد اجاگر ہوا اور جس وقت سے اس نے ایک علاحدہ و مستقل موضوع کی حیثیت اختیار کی اس وقت سے اس میں تصنیفی و تالیفی عمل کا آغاز ہو گیا۔

چنانچہ تیسری صدی ہجری کی کتب مواعظ میں "القصد الی اللہ" خاصی اہمیت کی حامل ہے، جس کے مصنف حضرت سفیان ثوری (م۔ ۱۶۱ھ) محدث اور السری السقطی (م۔ ۲۵۳ھ) کے شاگرد مشہور صوفی ابن ابوالقاسم جنید بن محمد بغدادی (م۔ ۲۹۷ھ) ہیں۔ بغدادی کی "معالی الہمۃ" بھی اہم کتاب ہے[۱۰]۔

اس صدی کی دوسری مشہور ادبی شخصیت ابوبکر عبید اللہ بن محمد المعروف بہ ابن ابی الدنیا (م۔ ۲۸۱ھ) کی تصنیف "امر بالمعروف والنہی عن المنکر" بھی اہم ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ (نوشتہ ۶۵۲ھ) رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ رضا اور خدا بخش میں ابن ابی الدنیا کے اور بھی کتب کے قلمی نسخے موجود ہیں جن میں "المنتقیٰ من کتاب (التقویٰ والجہاد والرہبان وحسن الظن باللہ)" "کتاب محاسبۃ النفس" "کتاب الرضا بالقضا" قابل ذکر ہیں[۱۱]۔

اس صدی کی ایک اور اہم کتاب ابو عبداللہ الحارث بن اسد المحاسبی البصری (م ـ ۲۴۳ھ) کی "رسالۃ المسترشدین"، ہے جو عبدالفتاح ابو غدہ کی تحقیق و تخریج کے بعد (ص ۲۱۹) بیروت سے ۱۹۶۴ء اور ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی ۔ شہاب الدین احمد ابن محمد ابن ابی الربیع (م ۲۷۲ھ) کی "سلوک المالک فی تدبیر الممالک" جو مؤلف مذکور نے معتصم باللہ العباسی کے لیے تصنیف کی تھی، آصفیہ میں مطبوع ۱۲۸۶ھ موجود ہے[12] چوتھی صدی ہجری میں اس موضوع پر تصنیف کی جانے والی کتب میں ابو اللیث نصر بن محمد السمرقندی الحنفی (م ـ ۳۷۵ھ) کی "بستان العارفین"، اہم ترین کتب میں شمار ہوتی ہے، جو (۱۵۸) ابواب اور (۱۰۸) صفحات (مطبعۃ مصطفی البابی حلبی) پر مشتمل اور متعدد پہلوؤں سے بحث کرتی ہے ۔ اس کا ایک قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری کے حبیب گنج کلکشن میں محفوظ ہے، یہ کتاب کلکتہ سے ۱۸۶۸ء بولاق سے ۱۲۸۹ء اور بمبئی سے ۱۳۰۴ء میں شائع ہوئی[13] مصنف مذکور کی دوسری تصنیف اسی موضوع پر "تنبیہ الغافلین"، (۹۵) ابواب اور (۲۳۹) صفحات پر مشتمل ہے، افادیت کے پیش نظر اس کے فارسی اور ترکی زبانوں میں ترجمے بھی ہو چکے ہیں ۔ یہ کتاب بھی کلکتہ سے ۱۸۶۸ء اور بمبئی سے ۱۳۰۴ء نیز اس کے بعد کئی بار شائع ہوئی[14]

اس صدی کی دیگر اہم کتب میں ابو حاتم البستی (م ـ ۳۵۴ھ) کا حکم و مواعظ، پند و نصائح اور دانائی سے پر اشعار کا مجموعہ (ص ۲۶۷) "روضۃ العقلاء و نزہۃ الفضلاء"[15] اور ابو الفرج معافی بن زکریا بن یحیٰ النہروانی (م ـ ۳۹۰ھ) کی احادیث پر مبنی وعظ و تذکیر کی مجالس پر مشتمل "الجلیس الصالح الکافی والانیس الناصح الشافی"، (اوراق ۹۴) کا نام آتا ہے ۔ اس کا قلمی نسخہ (نوشتہ ۹۶۲ھ) حبیب گنج کلکشن میں موجود ہے ۔

عباسی دور کے مشہور ادیب ابن عبد ربہ (م ـ ۳۲۸ھ) نے بھی اپنی معروف تصنیف "العقد الفرید"، جس کا شمار ادب کی اساسی کتب میں ہوتا ہے، کے (جو تین حصوں میں منقسم ہے) پہلے حصہ میں مواعظ پر گفتگو کی ہے ۔

ابو یحیٰ عبدالرحیم بن محمد بن اسماعیل بن نباتہ (م ـ ۳۷۴ھ) کی "خطب ابن نباتہ"، (سن تالیف ۳۵۱ھ) مطبوع ۱۳۱۱ھ آصفیہ میں موجود ہے[16]

پانچویں صدی کے کتب مواعظ میں ابو العلاء احمد بن عبداللہ المعری (م ـ ۴۴۹ھ) کی (۱۲۰)

کراسات پر مشتمل "کتاب العظۃ" [۱۷] اور "المواعظ السنیۃ" [۱۸]

ابوعبداللہ القضاعی (م۔ ۴۵۴ھ) کی دقائق الأخبار وحقائق الاعتبار [۱۹]

ابومنصور عبدالملک بن محمد اسماعیل الثعالبی النیساپوری (م۔ ۴۲۹ھ) کی "المبہج" اوراق ۲۴) جس کا ایک قلمی نسخہ حبیب گنج کلکشن میں ابوالمحاسن محمد بن سعد النخوانی معروف بہ ابن الساوجی کا نوشتہ ۷۱۳ھ موجود ہے۔

اس صدی کی ایک اہم فقیہ و مفکر شخصیت ابوالحسن علی بن محمد الماوردی (م۔ ۴۵۰ھ) کی انتہائی جامع اور مفید کتاب "ادب الدنیا والدین" ہے جس میں اخلاق و کردار کو سنوارنے والے دینی و دنیوی آداب اور تزکیۂ نفس کے طریقوں پر گفتگو کی گئی ہے۔ مصنّف مذکور کی دوسری امثال وحکم پر مشتمل کتاب "کتاب الأمثال والحکم" ہے، جس میں (۳۰۰) حکمتیں (۳۰۰) احادیث، اور ۳۰۰ اشعار بیان کیے گئے ہیں۔

چھٹی صدی ہجری ادب مواعظ کے ارتقا کی تاریخ میں خاصی زرخیز نظر آتی ہے۔ عالم اسلام کی عظیم شخصیت حجۃ الاسلام ابوحامد الغزالی (م۔ ۵۰۵ھ) کی "احیاء علوم الدین"، جو درحقیقت انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے، کو مواعظ کے موضوع پر سب سے عظیم اور مثالی تصنیف قرار دیا گیا ہے اس کتاب کی عظمت واہمیت کے پیش نظر کہتے ہیں کہ اگر اسلام سے متعلق ساری کتب تلف ہو جائیں اور "احیاء" باقی رہے تو تلف شدہ کتب سے یہ کتاب بے نیاز رکھے گی۔ اس کی کئی شروح بھی منظر عام پر آئیں جن میں "اتحاف السادۃ المتقین" (۱۳ جلدوں میں) فاس سے ۱۳۰۴ھ میں اور قاہرہ سے (۱۰ جلدوں میں) ۱۳۱۱ھ میں شائع ہوئی۔ ابن الجوزی کی منہاج القاصدین اور ابن یونس کی روح الاحیاء مشہور شروح میں شمار ہوتی ہیں۔ احیاء جو مصر سے ۱۲۸۹ھ اور ۱۳۰۶ھ اور پھر کئی بار شائع ہوئی۔ کا لب لباب بھی "الرشد الأمین الی موعظۃ المومنین" (ص ۳۱۲) کے نام سے ۱۳۴۱ھ میں مطبع مصطفیٰ الحلبی سے شائع ہوا [۲۱]۔ غزالی کی دیگر کتب مواعظ میں "بدایۃ الہدایۃ" [۲۲] "غررالدر فی المواعظ" بھی قابل ذکر ہیں [۲۳]۔ غرر کی شرح "شرح غرر غزالی" (اوراق ۱۲۱) مجہول المولف، کتاب خانۂ ناصریہ لکھنؤ میں موجود ہے [۲۴]۔ غزالی کی فارسی تصنیف "نصیحۃ الملوک" کا عربی ترجمہ

(مجہول المترجم) تعریب التبر المسبوک فی نصیحۃ الملوک کے نام سے مطبع کاستیلیہ سے ۱۲۷۷ھ میں شائع ہوا[۲۵]
ہوا[۲۵] ابوبکر محمد بن محمد بن الولید الفہری الطرطوشی (م ۔ ۵۲۰ھ) کی سراج الملوک، مطبوع ۱۲۸۹ھ[۲۶]
بھی لائق ذکر ہے۔

ابوحامد الغزالی کے بھائی احمد الغزالی (م ۔ ۵۲۰ھ) کی مجالس الشیخ احمد محمد الغزالی، مرتبہ صاعد بن فارس اللبنانی البغدادی، (۸۳) مجالس پر مشتمل اور (۲) مجلدات) میں ہے[۲۷]۔ اس دور کی دیگر کتب مواعظ میں ابوالقاسم اسماعیل بن محمد (م ۔ ۵۳۵ھ) کی الترغیب والترہیب، شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی (م ۔ ۵۶۱ھ) کی "غنیۃ الطالبین" (طبع بولاق ۱۲۸۸ھ) الفتح الربانی، (طبع قاہرہ ۱۳۰۲ھ) (۶۲) مواعظ پر مشتمل ہے اور فتوح الغیب، (اوراق ۸۷) جو (۶۸) مواعظ ومقالات پر مشتمل موعظت ومعرفت میں بڑے پایہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ نوشتہ ۱۰۱۹ھ، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور میں موجود ہے[۲۸]۔

اسی صدی کی کتب میں عبدالرحمٰن بن محمد بن عبداللہ ابوالبرکات ابن الانباری (م ۔ ۵۷۷ھ) کی نکھت المجالس،[۲۹] اور عبدالعزیز النسفی (م ۔ ۵۳۳ھ) کی روضۃ الناصحین، کے علاوہ اپنے دور کے مشہور ومعروف واعظ ابوالفرج عبدالرحمٰن ابن الجوزی (م ۔ ۵۹۷ھ) جنھوں نے وعظ کی علمی وفنی حیثیت متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، کی تقریباً (۳۰) کتابیں صرف وعظ وخطب کے موضوع پر ہیں[۳۱] ان کی اہم کتب میں "کتاب القصاص والمذکرین"، انتہائی نفیس اور مفید کتاب ہے جس میں انھوں نے مشہور مذہبی داستان گویوں کی بے اصل اور مضحکہ خیز روایتوں پر بحث کی ہے اور وعظ کے اصول ومبادی کا تعین کیا ہے[۳۲] ان کی بستان الواعظین وریاض السامعین، چند مجالس کے مجموعہ پر مشتمل ہے[۳۳]۔ ان کی "المنتخب" جو ایک جامع اور مبسوط کتاب ہے کو بڑی شہرت حاصل ہوئی[۳۴] انھیں کی دیگر تصنیفات میں عجب الخطب، جس میں (۳۰) مسجع خطبات کو جمع کیا گیا ہے[۳۵]۔ "یاقوتۃ المواعظ" یا "ذالیاقوتہ فی المواعظ"[۳۶] النطق المفہوم من اہل الصمت جس میں نباتات، جمادات اور حیوانات سے عبرت پذیری پر مواعظ جمع کیے گئے ہیں اور اس ضمن میں دینی قصص اور احادیث نبویہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے[۳۷] "درر وس القواریر"، خطب ومحاضرات

دو عظ و تذکیر پر مشتمل (ص ۶۴)[۳۸] "تحفۃ الوعاظ"، تحفۃ الواعظ و نزہۃ الملاحظ" (۲۵) فصول پر مشتمل ایک سود مند کتاب[۳۹] اور حسن السلوک الی فی مواعظ الملوک[۴۰]" قابل ذکر ہیں۔

اس کے علاوہ عثمان بن عیسیٰ البطلی الموصلی (م ۔ ۵۵۹ھ) کی "العظات الموقظات[۴۱]" اور جاراللہ زمخشری (م ۔ ۵۳۸ھ) کی اطواق الذہب فی المواعظ و الخطب" بھی اہم کتب میں شمار ہوتی ہے۔ اطواق الذہب مقامہ کے طرز پر (۹۹) مقالوں کا مجموعہ ہے۔ جس کو پروفیسر فون ہامر کی کوششوں سے جرمن ترجمہ کے ساتھ ویانا سے ۱۸۳۵ء میں شائع کیا گیا۔ ۱۸۶۷ء میں یہ پیرس سے فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ شائع ہوئی، اور بیروت سے لغوی تشریح کے ساتھ ۱۲۹۳ھ میں (ص ۷۵) اور ۱۳۱۴ھ میں (ص ۱۱۲) شائع ہوئی[۴۲] شیخ احمد کبیر رفاعی موسوی حسینی (م ۔ ۵۷۸ھ) کی الحکم الرفاعیۃ" بھی اس صدی کی اہم تحریر ہے جس کا فارسی ترجمہ قسطنطنیہ میں چھپا تھا اور اس کا اردو ترجمہ مولانا عبدالحلیم شرر نے کیا تھا۔ یہ ترجمہ ۱۹۱۶ء میں دلگداز پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔

ساتویں صدی ہجری کی کتب مواعظ میں ابوعبداللہ محمد بن ابی الفرج (م۔ اوائل چھٹی صدی ہجری) کی "انس الأبرار و طریق الأخیار" (اوراق ۱۳۵) احادیث صحیحہ، خطبات بلغاء، اقوال و امثال صلحاء و زہاد اور پند و موعظت پر مشتمل یہ کتاب "و ذکّر فإن الذکری تنفع المؤمنین" کے بنیادی تصور پر تالیف کی گئی ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ نوشتہ (۷۴۳ھ) عمر بن عثمان بن عمر العجمی حبیب گنج کلکشن میں موجود ہے[۴۳]۔

اس صدی کی مشہور صوفی شخصیت محی الدین ابن العربی (م ۔ ۶۳۸ھ) کی "المواعظ الحسنۃ[۴۴]" کے علاوہ اہم ترین کتاب "محاضرۃ الأبرار و مسامرۃ الأخیار" (ص ۳۷۶) ادبیات، مواعظ، امثال و حکایات نادرہ، اخبار انبیاء اور عرب و عجم کے بادشاہوں کی سیرت و واقعات پر مشتمل ہے، جن کا انتخاب انھوں نے (۳۸) کتابوں سے کیا ہے[۴۵]۔

اس دور کے ایک ہندوستانی مصنف جمال الدین ہانسوی (م ۔ ۶۵۹ھ) کی "ملہمات" کا تذکرہ ڈاکٹر زبیر احمد نے کیا ہے اور اس کے نمونے بھی فراہم کئے ہیں۔ جمال الدین سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے سلسلہ سے منسلک تھے۔ زبید احمد لکھتے ہیں کہ مصنف خود

ایک ممتاز صوفی تھے۔ انھوں نے سلسلۂ چشتیہ کی ایک شاخ کی بنا بھی ڈالی جو خود انھیں کے نام سے منسوب ہے۔ صوفیاء کرام کے اقوال و ملفوظات پر مشتمل یہ کتاب مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہے اور بڑے دلکش و دل پذیر انداز میں اس طرح مرتب کی گئی ہے کہ پوری کتاب پاکیزہ خیالی اور خوش بیانی کا دلکش مرقع محسوس ہوتی ہے[۴۶]۔ اس کا ایک قلمی نسخہ درگاہ شاہ ابوالخیر، چتلی قبر، دہلی میں موجود ہے[۴۷]۔

اسی صدی کے مشہور فقیہ صوفی تاج الدین محمد بن ابی بکر الرازی الملقب بالصدر (م۔۶۶۰ھ) کی (۶۰) ابواب پر مشتمل احادیث آثار اور مواعظ کا مجموعہ "حدائق الحقائق" نامی کتاب[۴۸] اور حافظ زکی الدین المنذری (م۔۶۵۶ھ) کی (۲) مجلدات اور (۲۵) کتب (فصول) پر مشتمل "الترغیب والترہیب"، جس کی تلخیص ابن حجر العسقلانی (م۔۸۵۲ھ) نے کی ہے[۴۹]۔ نیز ابو محمد بن قدامہ مقدسی (م۔۶۲۰ھ) کی کتاب "التوابین"[۵۰] بھی لائق ذکر ہیں۔

آٹھویں صدی ہجری میں ادب مواعظ پر جو کتابیں تخلیق کی گئیں ان میں عبدالحمید بن الرحمٰن الاقفوری (الاقفوی) (م۔ آٹھویں صدی ہجری) کی "منیۃ الواعظین" (سن تصنیف ۷۶۳ھ) کا قلمی نسخہ رضا لائبریری میں موجود ہے[۵۱]۔ مشہور متکلم ابو محمد عبداللہ، عفیف الدین الیافعی (م۔۷۶۸ھ) کی منظوم کاوش "الدر فی مدح سید البشر والغرر فی الوعظ والعبر"[۵۲]، ابن رجب الحنبلی (م۔۷۸۵ھ) کی "لطائف المعارف"، جس میں سال کے بارہ مہینوں کی مناسبت سے مواعظ مرتب کیے گئے ہیں۔ آغاز محرم الحرام سے اور اختتام ذوالحجۃ پر ہوا ہے[۵۳]۔ شیخ صدرالدین محمد البارزی (م۔۷۸۵ھ) کی الفائق فی المواعظ والرقائق (الدقائق) جس کا انتخاب ابن الحنبلی نے "السلسل الرائق" کے عنوان سے کیا تھا[۵۴]۔ اور شیخ بہاء الدین محمد بن محمد النقشبندی البخاری (م۔۷۹۱ھ) کی تنبیہ الغافلین[۵۵] قابل ذکر ہیں۔

علاوہ ازیں شیخ محمد بن مفلح حنبلی دمشقی (م۔۷۶۹ھ) کی "الآداب الشرعیہ"، جس کی جلد دوم کا ایک قلمی نسخہ منقول از اصل نسخہ مصنف آصفیہ میں موجود ہے[۵۶]۔ اور ابوعبداللہ محمد بن محمد المعروف بہ ابن الحاج (م۔۷۳۷ھ) کی "المدخل" (۳ مجلدات) مطبوع ۱۲۹۳ھ[۵۷]

بھی اہم کتب مواعظ میں شمار ہوتی ہیں۔

نویں صدی ہجری میں پیش کی جانے والی کتب مواعظ میں ابو مدین شعیب عبداللہ بن سعد بن عبدالکافی المشہور بالحریفش (ولادت ۔۸۰۱ھ) کی الروض الفائق فی المواعظ الرقائق،، اہم کتب میں شمار ہوتی ہے۔ یہ کتاب مواعظ و خطبات، احادیث اور قصائد و حکایات کا (۵۶) مجالس پر مشتمل ایک خوبصورت مجموعہ ہے۔ رضا لائبریری میں اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔ مصر سے ۱۳۰۴ھ میں جو نسخہ شائع ہوا تھا اس کے حاشیہ پر ابن عبدالعزیز الملیباری کی احادیث، آثار اور مواعظ پر مشتمل ایک کتاب اور ابو اللیث سمرقندی کی ،،قرۃ العیون،، شائع ہوئی تھیں[۵۸]۔ اس کے علاوہ شیخ عبدالرحمٰن بن عبدالسلام (م ۔۸۹۴ھ) کی ،،نزہۃ المجالس و منتخب النفائس،، بھی اس موضوع کی اہم کتاب ہے[۵۹]۔ ابو محمد الحبشی البسطامی (م۔۸۵۷ھ) کی (۲) جلدوں میں ،،روضۃ المجالس و انس المجالس[۶۰]،، اور محی الدین احمد بن ابراہیم النحاس الدمشقی (م ۔۸۱۴ھ) کی تنبیہ الغافلین عن اعمال الجاہلین و تحذیر السالکین عن افعال الہالکین،، (سن تالیف ۸۱۱ھ) جس کا اختصار شیخ محمد برکات الخزومی نے کیا تھا، قابل ذکر ہیں[۶۱]۔

دسویں صدی ہجری کی مشہور کتب مواعظ میں جلال الدین السیوطی (م ۔۹۱۱ھ) کی تحذیر الخواص من اکاذیب القصاص،، جو داستان گویوں کے من گھڑت قصوں اور غیر حقیقی واقعات پر سے پردہ اٹھاتی ہے کے علاوہ ،،المنتخب من نزہۃ المجالس،، جس کا قلمی نسخہ خدا بخش میں محفوظ ہے اور الدر الحسان فی البعث و نعیم الجنان،، قابل ذکر ہیں[۶۲]۔ ابو المواہب عبدالوہاب بن احمد شافعی مصری معروف بہ الشعرانی او الشعراوی (م ۔۹۷۳ھ) کی مختصر تذکرۃ الامام ابی عبداللہ القرطبی،، (سن تصنیف ۹۶۸ھ[۶۳]) اور الجواہر و الدرر الکبری[۶۴]،، شرف الدین عبدالمومن بن ہبۃ اللہ المغربی الأصفہانی (م۔ دسویں صدی ہجری) کی ،،اطباق الذہب،، (ص ۱۱۲[۶۵]) بھی ادب مواعظ کا حصہ ہیں۔

اس صدی کے ہندوستانی علماء جنھوں نے اس موضوع پر عربی زبان میں طبع آزمائی کی، زین الدین بن عبدالعزیز المعبری الملیباری (م ۔ دسویں صدی ہجری) کی ارشاد العباد إلی

سبیل الرشاد،، (ص ۱۴۹) کا تذکرہ کرتے ہوئے صاحب المعجم نے لکھا ہے کہ یہ کتاب مطبع عبدالرزاق سے ۱۳۰۲ھ میں شائع ہوئی تھی جس کے حاشیہ پر مؤلف کے مواعظ شامل ہیں۔ مطبعة میمنیہ سے بھی یہ کتاب ۱۳۱۲ھ میں شائع ہوئی[۶۶]۔ زین الدین ملیباری کی (۲) کتابوں کا تذکرہ فہرست عربی مخطوطات خدابخش لائبریری جرنل میں ہے۔ ایک تو ارشاد الاُولیاء،، اور دوسری ،، ارشاد الألبائی فی ہدایۃ الأذکیا،، یہ دونوں مخطوطے آصفیہ میں موجود ہیں[۶۷]۔ ہندوستان ہی کی ایک مشہور شخصیت علی بن حسام الدین المعروف بالمتقی الحنفی الجونپوری برہانپوری (م۔ ۹۷۵ھ) کی نظم الدرر فی الحکم الغرر،، (اوراق ۴۳) کا قلمی نسخہ نوشتہ محمد بن عبدالملک الحضرمی، حبیب گنج کلکشن میں موجود ہے۔ علی متقی کی دوسری تالیف جو اس موضوع پر اہم کتب میں شمار کی جاتی ہے "جوامع الکلم فی المواعظ والحکم،، کے قلمی نسخے سبحان اللہ کلکشن علی گڑھ، رضا لائبریری رام پور اور خدابخش میں موجود ہیں۔ علی گڑھ کا نسخہ (۱۷۵) اوراق پر مشتمل اور ۱۰۳۹ھ کا محمد حسین نامی کاتب کا نوشتہ ہے۔ یہ تقریبًا تین ہزار مواعظ و نصائح کا مجموعہ ہے جن میں (۵۰۰) اقتباسات قرآن سے (۵۰۰) تضمینات احادیث سے مع تشریحی عبارتوں کے (۳۰۰) اقوال ابوالعطا اسکندری (م۔ ۷۰۹ھ) کے اور (۱۰۰) اقوال ان کے شاگرد کے ہیں۔ باقی مواعظ و نصائح متقدمین کے اقوال پر مشتمل ہیں[۶۸]۔

دسویں صدی ہجری کی ایک اہم کتاب شیخ ابونصر محمد عبدالرحمٰن الہمدانی کی (۷) مجالس پر مشتمل "السبعیات فی مواعظ البریات،، ہے۔ محمد الہلالی القاضی نے اس کتاب کا ترکی ترجمہ بھی "مجلس آرار،، کے نام سے کیا تھا۔ اس ترجمہ میں انھوں نے کتاب کی تکمیل کا سن ۹۹۷ھ لکھا ہے[۶۹]۔

گیارہویں صدی ہجری میں ہمیں جن کتب مواعظ کا علم ہو سکا ہے وہ اس طرح ہیں، عبدالصمد بن فقیہ حسین بن فقیہ محمد (م۔ گیارہویں صدی ہجری) کی "انیس المتقین،، جو حبیب گنج کلکشن میں موجود ہے۔ عبداللہ بن محمد بن علی الہروی الأنصاری (م۔ ۱۰۸۹ھ) کی منازل السائرین الی الحق المبین[۷۰]،، اور "موعظۃ الحبیب وتحفۃ الخطیب[۷۱]،، ملا محمود بن شیخ محمد بن شاہ محمد فاروقی جونپوری (م۔ ۱۰۶۲ھ) کی "المقالات اللطیفۃ المسماۃ بالمقالات السنیۃ فی الحکم النبویۃ (اوراق ۱۰۹) ۲۳ مقالات پر مشتمل ہے[۷۲]۔

بارہویں صدی ہجری کی اہم کتب مواعظ میں شیخ عبداللہ الشبراوی (۱۱۷۲ھ) کی حِکَم ونصائح اور مواعظ وامثال کا مجموعہ "عنوان البیان وبستان الأذہان" جس کے مصر سے کئی ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں[۳] احمد بن عبدالمنعم الدمنہوری (م-۱۱۹۲ھ) کی اہل ادب ومواعظ کے کلام سے منتخب اور اہم فوائد پر مشتمل مجموعہ "سبیل الرشاد إلی نفع العباد" جو مطبع شرف سے ۱۳۰۵ھ میں شائع ہوا[۴] اور سید عبداللہ الحسنی المعروف بہ الحداد (م-۱۱۳۲ھ) کی "النصائح الدینیہ والوصایا الایمانیہ"[۵] قابل ذکر ہیں۔

تیرہویں صدی ہجری کے ادب مواعظ میں شیخ عبدالمجید الشرنوبی ازہری کی "شرح حکم ابن عطاء اللہ السکندری" جو مصر سے ۱۲۷۹ھ میں شائع ہوئی[۶]۔ اور "تحفۃ العصر ونخبۃ النصح المفید" (ص ۹۵) جو بولاق سے ۱۳۱۶ھ میں شائع ہوئی[۷]۔ شیخ عثمان بن حسن بن احمد شاکر الخوبوی (م- تیرہویں صدی ہجری) کی "درۃ الناصحین" (سن تصنیف ۱۲۲۴ھ) وعظ سے متعلق قرآنی آیات کی تفسیر اور احادیث کی تشریح پر مشتمل مجالس کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب بولاق سے ۱۲۶۴ھ میں (ص ۳۱۵)، اور ۱۲۷۹ھ میں (ص ۳۱۸) میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ آستانہ سے ۱۲۶۹ھ میں اور بمبئی سے ۱۳۰۷ھ میں (ص ۳۳۸) درۃ الواعظین فی تفسیر آیات واحادیث تحفۃ الواعظین الموسوم بہ درۃ الناصحین" اور آستانہ سے ۱۲۶۴ھ میں "المجالس" کے نام سے ترکی وعربی میں شائع ہوئی، پھر ۱۳۲۷ھ میں (ص ۳۳۲) درۃ الناصحین" کے نام سے شائع ہوئی[۸]۔ اس کے علاوہ شیخ علی بن سلیمان الدمناتی (مصر میں ۱۲۹۹ھ میں موجود ہونا ثابت ہے) کی "النصیحۃ التامۃ للخلیفۃ العامۃ"[۷۹] ابو محمد احمد بن ادریس الحسینی المغربی الأندلسی (م-۱۲۵۳ھ) کی "المحامد الثمانیۃ او المحامید والأحزاب"[۸۰]، علی بن احمد بن خالد بن عبدالرحمن البرقی الکوفی (م - تیرہویں صدی ہجری) کی "آداب النفس" (اوراق ۱۰۱)[۸۱]، اور شیخ الٰہی بخش کاندھلوی (م- ۱۲۴۵ھ) کی احادیث نبویہ سے منتخب "جوامع الکلم"[۸۲] حسن بن علی الیزدی امامی (م- ۱۲۹۷ھ) کی "انوار الہدایۃ وسراج الأئمۃ"[۸۳] اور اس موضوع پر بڑی اہم کتاب عبدالرحیم بن احمد القاضی کی "احوال القیامۃ" جس کو پروفیسر ایم۔ وولف (M. WOLF) LEIDZIG

کے جرمن ترجمہ کے ساتھ لابسیگ سے ۱۲۸۷ھ میں شائع کیا گیا، قابل ذکر ہیں۔[84]

چودھویں صدی ہجری میں عربی زبان میں تصنیف کی گئی کتب مواعظ میں نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی (م - ۱۳۰۷ھ) کی "الموعظة الحسنة بما يخطب به في شهور السنة"[85] قاسم الشماخی بن سعید (م - ۱۳۳۴ھ) کی الحکمة فی شرح رأس الحکمة لعثمان کمال الدین" (ص ۴۸)[86] احمد بن زینی دحلان (م - ۱۳۰۴ھ) کی تنبیہ الغافلین مختصر منہاج العابدین"[87] سید محمد بن احمد (م - ۱۳۱۶ھ) کی "احسن المواعظ وازین الملافظ" (سن تکمیل ۱۲۹۰ھ) تزکیہ نفس اور اخلاق وموعظت پر (۲۸۰) اشعار کا مجموعہ[88] حسن الجریدلی (م - ۱۳۱۷ھ) کی بدائع الحکم" (ص ۱۵۶)[89] احمد بن اسماعیل البرزنجی (چودھویں صدی ہجری) کی "النصيحة العامة لملوك الإسلام والعامة" جو غالباً مصر سے طبع ہوئی تھی[90] عبدالرحمن نگرامی ندوی (م - ۱۳۴۴ھ) کی "لآلی الحکم" جس میں احادیث نبویہ سے حکمت وموعظت کے موتیوں کو اکٹھا کیا گیا ہے[91]۔ اسحٰق البردوانی (م - ۱۳۵۷ھ) کی "اللؤلؤ المكنون بالأمثال التي تمثل بها الأمين المامون"، اس کتاب میں بھی احادیث نبویہ سے موعظت اور پند ونصائح جمع کیے گئے ہیں[92]۔ اور شیخ احتشام الحسن کاندھلوی (م - ۱۳۹۲ھ) کی احادیث نبویہ سے منتخب مواعظ ونصائح کے مجموعہ "منابع الحکم من کلام سید ولد آدم صلی اللہ علیہ وسلم"، جوامع الکلم من کلام سید ولد آدم صلی اللہ علیہ وسلم" اور حاشیة علی منابع الحکم" قابل ذکر ہیں[93]

مذکورہ کتب کے علاوہ سید عبدالرحمن البرقوقی کی "البهجة البرقوقية" (شرح قصیدہ سید علی رضا (ص ۹۳)[94]، ابراہیم ذکی کی "حدیقة الأزهار اليانعة في الرد على ذوي المساوي الشائعة" (ص ۳۲)[95] خیر الدین ابو البرکات (م - ۱۳۱۷ھ) کی غالية المواعظ ومصباح المتعظ وقبس الواعظ" (سن تصنیف ۱۳۰۰ھ)[96] شیخ احمد المیہی الشبینی النعمانی کی "دیوان خطب جمعیة"[97]، محمد امین الکردی (م - ۱۳۳۲ھ) کی دیوان خطب لنصيحة البرية في الخطب المنبرية"[98] اور محمد عبدالسلام عبدالحمید کی "المواعظ الحميدة فی الخطب السدیدہ" (ص ۱۴۴)[99] بھی ادب مواعظ میں قابل قدر اضافہ ہیں۔ دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور میں مجہول المؤلف کی کتاب المواعظ" (اوراق ۲۰۰) جس کی کتابت سید دوست محمد

پشاوری نے ۱۳۰۳ھ میں کی تھی[۱۰۰] بھی لائق ذکر ہے۔

چودھویں صدی ہجری کی چند اور اہم کتب مواعظ میں علی فکری آفندی (م - ۱۳۷۲ھ) کی "عظة النساء"، جس میں خواتین کو مخاطب کرکے پند و موعظت کی باتیں کی گئی ہیں۔ فضل باشا بن علوی بن محمد بن سہل الحسینی الملیباری المکی (م - ۱۳۱۸ھ) کی "عدّة الأمراء والحکام لاہانة الکفرة وعبدة الأصنام"، میں حکام و سلاطین کو اہم امور کی آگاہی دیتے ہوئے اللہ اور اس کے دین و احکام سے واقف کرایا گیا ہے، نیز سلاطین و رعیت دونوں کے لیے احکام اسلام بیان کئے گئے ہیں[۱۰۲] علوی بن عباس المالکی المکیّ (م - ۱۳۹۱ھ) کی "المواعظ الدینیہ"، میں معاملات اور اسلامی ارشادات و ہدایات پر روشنی ڈالی گئی ہے[۱۰۳]۔

شیخ ابونصر احمد بن محمد الحدّادی کی "بساتین المذکرین و ریاحین المتذکرین"[۱۰۴] ابوسعید الحسن بن علی المطوعی کی "ریاض الانس"[۱۰۵] محی الدین الغرناطی کی "عظة الألباب"[۱۰۶] حسن بن علی الواعظ النیساپوری کی "حدائق الموعظة"[۱۰۷] شیخ احمد الرومی کی "مجالس الأبرار و مسالک الأخیار"، جس میں مصابیح کی ایک سو احادیث کی واعظانہ انداز میں تشریح کی گئی ہے[۱۰۸]، ولی الدین اللازقی کی "موعظة الواعظین"، جو (۷) کتب (فصول) میں مواعظ پر مشتمل ہے[۱۰۹]۔ شیخ محمد الجنبیہی کی "رحمة مولانا الملک القدوس" (ص ۱۱۲)[۱۱۰] عبدالقادر الحسینی الازہری کی "تذکرة أولی البصائر فی الکبائر والصغائر" (ص ۲۴)[۱۱۱] ابن طغرل بیک کی "النطق المفہوم من اہل الصمت المعلوم"[۱۱۲] شیخ محمد بن ابی بکر المشہور بالعصفور کی "الموعظ العصفوریة" (ص ۵۶) جس میں (۴۰) احادیث نبوی کی تشریح و توضیح کی گئی ہے[۱۱۳]۔ شیخ یوسف بن سعید بن اسماعیل الصفتی المالکی کی "نزہة الأرواح فی بعض أوصاف الجنّة دار الأفراح" (ص ۵۶)[۱۱۴] محمد عبدالعزیز الخولی کی "الأدب النبوی، عظات بالغة وحکم عالیة وآداب سامیة"، عبداللہ المراغی کی "العظات البینات"، اور محمد بن حسن المرزوقی کی ترتیب دادہ "المواعظ السنیة فی الخطب النجدیة"، بھی مواعظ کے موضوع پر اہم کتب شمار ہوتی ہیں۔ اس آخری پیراگراف میں مذکور تالیفات کے مؤلفین کا زمانہ نامعلوم ہے لیکن ان میں سے اکثر تالیفات کی طباعت گذشتہ صدی کے اواخر یا اس صدی میں ہوئی۔

لہٰذا ہم نے ان کا تذکرہ احتیاطاً آخر میں کیا ہے۔

عربی زبان میں مواعظ کے موضوع پر تصنیفی و تالیفی عمل کے اس جائزہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر قرآن کے تصوّر موعظہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اور بعض کتب مواعظ تو اپنی علمیت وجامعیت، تنوّع اور پر تاثیر اسلوب بیان میں اس قدر اعلیٰ درجہ کی وجود میں آئیں کہ ان کو صف اوّل کی کتب میں شمار کیا گیا اور علوم اسلامیہ کے پورے تالیفی و تصنیفی ذخیرہ میں ان کو منفرد و ممتاز مقام حاصل ہوا۔ ان کتب کی ادبی و فنّی حیثیت بھی مسلّم ہے۔ ان کا اسلوب بیان سلیس اور شستہ ہے، یہ سنجیدگی و متانت سے پر ہیں، زیر بحث مسائل میں عمیق و دقیق نکات کو بھی عام فہم زبان میں بے ساختگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ان میں جاذبیت، اثر انگیزی اور دلوں میں حرارت پیدا کرنے کی وہ خوبیاں ہیں کہ بسا اوقات قاری بےخود سا ہو جاتا ہے، تشویق و تبشیر ہو یا انذار و تخویف ایسے لطیف پیرایہ میں ہوتی ہے کہ قاری ان کو پڑھ کر بغیر کسی تکلیف و تصنّع کے خود بخود اس ماحول میں پہنچ جاتا ہے جہاں صاحب کتاب اسے لے جانا چاہتا ہے، عبارتوں میں ایک لہر سی دوڑتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ لہر کبھی قاری کے قلب کو جھنجھوڑ دیتی ہے، کبھی اس میں امنگ و ولولہ جگا دیتی ہے اور کبھی اس میں کپکپاہٹ پیدا کر دیتی ہے۔ عالم کیف میں آکر قاری کا دل کبھی رو پڑتا ہے، آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں، جسم کانپ اُٹھتا ہے، اور کبھی مست خرام لطیف سا جھونکا اس کی روح و قلب کو سرشار کر دیتا ہے اور اس کو اپنا سارا وجود ہلکا پھلکا، گناہوں کے بوجھ سے عاری، نرم ہواؤں میں تیرتا محسوس ہونے لگتا ہے۔

الغرض وعظ و تذکیر کی وہ تمام شکلیں جن میں عرفان نفس، عرفان خالق اور حدود شریعت پر قائم رہنے کی دعوت دی جاتی ہے، جن میں کوئی کجی نہیں ہوتی، جو حدود سے تجاوز نہیں کرتیں، جو مومن کے ظاہر و باطن کو صاف و شفاف کرتی اور اس کی شخصیت کو نکھارتی ہیں، جو اس کے مادّی و روحانی ارتقاء میں ممدّ و معاون ہوتی ہیں، جو انسان کو دین میں تفقّہ کرنے، دنیا کی بے ثباتی کو واضح کر کے اس سے عدم رغبت کا احساس اجاگر کرنے اور حقوق اللہ و حقوق العباد کے تئیں شعور پیدا کرنے کا کام انجام دیتی ہیں، وہ تمام شکلیں ہم کو ان واعظین و علماء کے یہاں ملتی

ہیں جو علماء حق کی حیثیت سے معروف و مشہور ہیں اور جن کی شان امتیاز قول و عمل کی سچائی میں پنہاں ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں جاذبیت و جامعیت بھی ہے، ان کی گفتگو میں تسکین و طمانینت کا سامان بھی ہے، ان کی عبارتوں میں ربط و تاثیر بھی ہے، ان کے اسالیب میں گہرائی و گیرائی بھی ہے، زبان میں رعنائی و شگفتگی بھی ہے، بیان میں قوت و شوکت بھی ہے اور رقّت و خشیت بھی، تربیت و تہذیب بھی ہے اور انذار و تبشیر بھی، یہی وہ صنف کلام ہے جس کو ہم ادب مواعظ کہتے ہیں۔

حواشی

۱۔ ملاحظہ ہو، سورۃ البقرۃ/۲۳۱ و ۲۷۵، سورۃ النساء/۶۳-۶۴، سورۃ آل عمران/۱۳۷، ۱۳۸، سورۃ الأعراف/۱۴۵، سورۃ یونس/۵۷ سورۃ ہود/۱۲۰، سورۃ النحل/۱۲۵، سورۃ النور/۳۴، سورۃ الذاریات/۵۵

۲۔ صحیح بخاری/علم، دعوات، احکام وغیرہ۔

۳۔ سنن ابی داؤد/صلاۃ

۴۔ صحیح بخاری/علم

۵۔ سنن ابی داؤد/سنۃ

۶۔ جامع ترمذی/ادب

۷۔ ملاحظہ ہو، دائرہ معارف اسلامیہ، ۲/۱۴/۷-۱۵، لاہور ۱۹۸۷ء جس میں مقالہ نگار محمود الحسن عارف نے ابو طالب مکی کی "قوت القلوب"/۱۴۸-۱۵۱ اور ابن الجوزی کی کتاب القصاص والمذکرین/۱۰ کے حوالہ سے گفتگو کی ہے۔

۸۔ مصدر سابق ۲/۱۴/۷-۱۵

۹۔ ملاحظہ ہو، البقرہ/۲۳۱ اور الأعراف/۱۴۵ نیز مکاتیب رسولؐ۔ جو آپؐ نے اُمراء و سلاطین کو ارسال فرمائے تھے۔ اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ موعظہ مکتوب شکل

میں بھی ہوتا ہے۔

۱۰۔ اوّل الذکر کتاب مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ میں اور موخر الذکر رضا، علی گڑھ اور آصفیہ میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ ۱۹۹۲ء فہرست عربی مخطوطات۔

۱۱۔ مصدر مذکور

۱۲۔ فہرست کتب عربی و فارسی اور اردو، کتب خانہ آصفیہ، فن مواعظ/۲

۱۳۔ حاجی خلیفہ: کشف الظنون ۱/۴۳۲، معجم المطبوعات/۱۰۴۵

۱۴۔ معجم/۱۰۴۵، کشف/۴۸۷

۱۵۔ کردستان سے ۱۳۲۸ھ شائع ہوئی، معجم/۵۶۴

۱۶۔ فہرست کتب خانہ آصفیہ، مواعظ/۳

۱۷۔ کشف/۱۴۳۹

۱۸۔ کشف/۱۸۹۰

۱۹۔ آستانہ سے ترکی ترجمہ کے ساتھ ۱۳۰۹ھ میں (ص ۶۸) شائع ہوئی۔ بعد میں ۱۳۲۰ھ میں بھی شائع ہوئی معجم/۱۵۱۵

۲۰۔ اوّل الذکر کتاب آستانہ سے ۱۲۹۹ھ میں اور مصر سے کئی بار شائع ہوئی۔ دیکھیے جرجی زیدان "تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ، ۲/۲۳۴-۲۳۵

۲۱۔ کشف/۲۳-۲۴، جرجی زیدان۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ۳/۱۰۶ دارالہلال و معجم ۱۴۱۴

۲۲۔ علی گڑھ میں اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔ قاہرہ سے کئی بار شائع ہوئی۔

۲۳۔ کشف/۱۲۰۱

۲۴۔ ملاحظہ ہو، مضمون اعجاز ترمذی: "کتاب خانہ ناصریہ لکھنؤ کے بعض عربی مخطوطات" خدا بخش لائبریری جرنل/۳۷۵

۲۵۔ معجم/۵۷۰-۵۷۱

۲۶۔ فہرست کتب خانہ آصفیہ مواعظ/۳

۲۷۔ کشف/۲/۱۵۹۰

۲۸۔ فہرست مخطوطات دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور ۲/۱۴۳

۲۹۔ فوات الوفیات ۲/۲۹۴

۳۰۔ کشف/۹۳۴

۳۱۔ جرجی زیدان: مصدر مذکور ۳/۱۰۲/ ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء مصدر مذکور ۳/۱۰۲

۳۲۔ تحقیق MNRRLINL SWARTZ لاہور

۳۳۔ کشف/۲۴۴

۳۴۔ کشف/۱۸۵۰

۳۵۔ کشف/۱۱۲۸

۳۶۔ عثمان المیری کی رونق المجالس کے ساتھ شائع ہوئی۔ معجم المطبوعات/۶۸

۳۷۔ "النطق المفہوم من اہل الصمت المعلوم" کے نام سے ایک اور کتاب ابن طغربک احمد کی بھی ہے جو وہبیہ سے (ص ۱۴۴) ۱۲۸۱ھ میں اور المیمنیہ سے (ص ۱۸۴) ۱۳۰۸ھ میں شائع ہوئی۔

۳۸۔ معجم المطبوعات/۶۷

۳۹۔ کشف/۳۷۶

۴۰۔ کشف/۳۶۶

۴۱۔ کشف/۱۴۲

۴۲۔ معجم المطبوعات/۹۷۴

۴۳۔ ملاحظہ ہو پروفیسر عبدالباری، "انس الابرار و طریق الاخیار (مضمون) خدا بخش لائبریری جرنل ۶۱/۱۹۹۲ء

۴۴۔ اس کا قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔

۴۵۔ مصر سے ۱۲۸۲ھ اور اس کے بعد کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ معجم المطبوعات/۱۷۹

۴۶۔ ڈاکٹر زبید احمد۔ عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصّہ (اردو ترجمہ) ۱۱۳، ۳۱۶
۴۷۔ خدابخش لائبریری جرنل رفہرست عربی مخطوطات نمبر ۳۶۸
۴۸۔ کشف/۶۳۴، نیز دیکھیے اسماعیل پاشا بغدادی: "ہدیۃ العارفین" ۲/۱۲۷، استنبول ۱۹۵۵ء
۴۹۔ کشف/۴۰۰
۵۰۔ کشف/۷۵۱
۵۱۔ کشف/۱۸۸۷
۵۲۔ کشف/۷۵۱
۵۳۔ کشف/۱۵۵۴
۵۴۔ کشف/۱۲۱۷
۵۵۔ کشف/۴۸۸
۵۶۔ فہرست کتب خانہ آصفیہ، مواعظ/۳
۵۷۔ مصدر سابق/۳
۵۸۔ معجم المطبوعات/۷۵۱
۵۹۔ مصر سے کئی بار شائع ہوئی، معجم المطبوعات/۱۲۱۳
۶۰۔ کشف/۹۳۲
۶۱۔ کشف/۴۸۸
۶۲۔ معجم المطبوعات/۱۰۷۹، الدر الحسان مصر سے ۱۲۷۶ھ اور ۱۲۹۹ھ میں شائع ہوئی۔
۶۳۔ معجم المطبوعات/۱۱۳۳
۶۴۔ المنجد فی الاعلام، طبع/۱۱ و کشف ۶۱۸
۶۵۔ معجم المطبوعات/۱۳۰۰، یہ کتاب بیروت سے ۱۳۰۹ھ میں شائع ہوئی۔
۶۶۔ معجم المطبوعات/۱۷۶۲
۶۷۔ خدابخش لائبریری جرنل، فہرست عربی مخطوطات۔

۶۸۔ ڈاکٹر زبید احمد: مصدر مذکور/ ۱۱۶ و ۳۲۰

۶۹۔ کشف/ ۹۷۷

۷۰۔ المنجد فی الإعلام، طبع/ ۱۱

۷۱۔ اسماعیل باشا، ایضاح المکنون فی ذیل علی کشف الظنون ص/ ۶۰۷، طبع ۱۹۴۵ء

۷۲۔ حبیب گنج کلکشن میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔

۷۳۔ معجم المطبوعات/ ۱۰۹۹

۷۴۔ معجم المطبوعات/ ۲۸۲-۲۸۳

۷۵۔ ایضاح/ ۶۴۹

۷۶۔ معجم المطبوعات/ ۱۱۱۹

۷۷۔ معجم المطبوعات/ ۱۱۱۹

۷۸۔ معجم المطبوعات/ ۸۴۲

۷۹۔ مطبعۃ وہبیہ سے ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی۔ معجم/ ۵۲۸

۸۰۔ آستانہ سے ۱۳۲۸ھ میں اور پھر کئی بار شائع ہوئی۔ معجم المطبوعات/ ۳۹-۴۰

۸۱۔ اس کا قلمی نسخہ سبحان اللہ کلکشن (مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ) میں موجود ہے۔

۸۲۔ محمد خالد علی؛ مساہمۃ الہند باللغۃ العربیۃ فی الأدب الحدیث النبوی (مقالہ ڈاکٹریٹ شعبہ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۱۹۹۲ء) ۳/ ۲۸۸

۸۳۔ الاعلام للزرکلی

۸۴۔ معجم/ ۱۲۸۱، اس کتاب کے مصنف کا زمانہ نامعلوم ہے۔ سن اشاعت کی وجہ سے ہم نے اسے اس صدی کے ضمن میں شمار کیا ہے۔

۸۵۔ بولاق سے ۱۳۰۱ھ اور ہندوستان سے ۱۲۹۵ھ میں (ص ۳۳۰) شائع ہوئی۔ معجم/ ۱۲۰۵
ایضاح/ ۶۰۷

۸۶۔ اسکندریہ سے ۱۳۱۲ھ میں شائع ہوئی۔ معجم/ ۱۱۴۲

۸۷۔ معجم/۹۹۰

۸۸۔ یوسف کوکن، عربک اینڈ پرشین ان کرناٹک/۵۲۳، مدراس ۱۹۷۴ء

۸۹۔ الظاہریۃ سے ۱۳۱۳ھ میں شائع ہوئی۔ معجم/۶۸۶

۹۰۔ معجم/۵۴۸

۹۱۔ محمد خالد علی؛ مصدر مذکور ۳/۲۹۰

۹۲۔ مصدر سابق ۳/۲۹۲

۹۳۔ مصدر سابق ۳/۲۹۳ و ۲۹۵

۹۴۔ مطبع شرف سے ۱۳۱۲ھ میں طبع ہوئی۔ معجم/۵۵۱

۹۵۔ مطبعۃ المعارف ۱۳۱۳ھ، معجم/۱۶

۹۶۔ ج/۱ بولاق ۱۳۰۱ھ، ج/۲، مط، سعادۃ ۱۳۲۹

۹۷۔

۹۸۔ معجم/۱۵۵۴

۹۹۔ معجم/۱۶۷۶

۱۰۰۔ ملاحظہ ہو، فہرست مخطوطات۔ دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور/۸۹، مخطوطہ نمبر ۱۸۸

۱۰۱۔ معجم المطبوعات/۱۴۵۸

۱۰۲۔ طبع مصر ۱۲۷۳ھ، معجم/۱۴۲۱، ایضاح/۴/۹، الاعلام للزرکلی

۱۰۳۔ الاعلام للزرکلی۔

۱۰۴۔ کشف/۲۴۳

۱۰۵۔ کشف/۹۳۵

۱۰۶۔ کشف/۱۱۴۲

۱۰۷۔ کشف/۶۳۴

۱۰۸۔ کشف/۱۵۹۰

۱۰۹- کشف/ ۱۹۰۹

۱۱۰- مطبوعہ بولاق ۱۳۱۶ھ، معجم/ ۱۴۷

۱۱۱- مطبوعہ مطبعۃ علمیہ ۱۳۱۱ھ، معجم/ ۷۷۲

۱۱۲- معجم/ ۱۴۵، ایضاح/ ۶۵۵

۱۱۳- مطبوعہ آستانہ ۱۳۰۶ھ، معجم/ ۱۳۲۱

۱۱۴- مصر سے ۱۲۷۷ھ اور مطبعۃ شرف سے ۱۳۰۵ھ میں شائع ہوئی، معجم/ ۱۲۱۰

ڈاکٹر سید قدرت اللہ الباقوی

مولانا عبدالحی احقر بنگلوری

وعظ کے مجتہد اعظم

علّامہ عبدالحی احقر بنگلوری وعظ وارشاد کے مجتہد اعظم تھے، سامعین کو متأثر کرنے میں انھیں یدِ طولیٰ تھا، ہنسانا، رُلانا، مست کر دینا اور بے قرار کر دینا اور انھیں سیماب پا بنا کر عقائد و اعمال کا احتساب کرنے پر آمادہ کرنا مولانا احقرؔ کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا، ملّت کے ذہنی امراض کی تشخیص کر کے نفسیاتی علاج کرتے تھے، علاج سے پہلے فاسد عقائد و بُرے اعمال کے اسباب و نتائج کی بھیانک تصویر کشی کر دیتے، عام فہم زبان میں عقائد و اعمال کی اصلاح فرماتے تھے عبارت آرائی و قافیہ پیمائی سے گریز کرتے زبان صاف سادہ اور دلنشیں تھی روزمرہ اور محاورات سے دلچسپی پیدا کرتے آواز بھی دلکش و سحر آگیں تھی اشعار پڑھتے تو ترنّم سے طلسماتی کیفیت کا سماں بن جاتا تھا آپ کے مواعظ میں تازگیٔ فکر، بلندیٔ نظر، قوّتِ اجتہاد، استدلال کا نرالا انداز تھا، طلاقتِ لسانی و فصاحتِ بیان کے ذریعہ سامعین کے دل و دماغ کو جذبۂ خلوص سے لبریز کر دیتے تھے، کمزور اعتقادات و غیر اسلامی رسوم کی فریب کاری اور ان کے دوررس نتائج کا انکشاف کرتے، مغالطوں کا ازالہ فرماتے اور اشکالات کے دنداں شکن جوابات بھی دیتے تھے بعض اوقات مناظرہ کے لیے بھی تیار ہو جاتے۔

حضرت احقرؔ کے آبا و اجداد سلطنتِ خداداد کے اعلیٰ مناصب پر فائز تھے سلطنتِ خداداد

کے سقوط کے بعد ان کا خاندان شکستہ تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر گیا، ریاست کرناٹک میں جا بجا عام مسلمانوں کے ساتھ تختۂ مشق ستم بن گئے مگر سلطنت خداداد کی خاکستر میں جو چنگاریاں چھپی ہوئی تھیں جا بجا بھڑک اٹھیں، انھیں شرر ہائے جہاں تاب سے کرناٹک کی سرزمین میں علم و عرفان اور تبلیغ و تعلیم کے چراغ روشن ہونے لگے ویلور میں خانقاہ علم شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد سے ہی فیض رساں تھی اسی شہر میں ایک اور دانش کدہ باقیات صالحات جلوہ گر ہوا، چکمگلور میں مدرسہ خضر، کولار میں مدرسہ اصلاح المسلمین، شرزہ پور میں مدرسۃ انوار المسلمین، میسور میں مدرسہ بحر العلوم، بنگلور میں مدرسہ قوۃ الاسلام، مدرسہ اسلامیہ اور مدرسہ مفید نسواں کی نشأۃ ثانیہ ہونے لگی، ان مراکز علم و عرفاں کے علاوہ ریاست کرناٹک میں کئی صوفیا و علماء مثلاً شاہ عارف، شاہ کمال، شاہ میر، شاہ مقبل، شاہ عثمان، شاہ پیر، میر حیات، حضرت درگاہی، مولانا غلام نبی اور مولانا غلام عابد، نلمنگل میسور، گلشن آباد، بنگلور، چکمگلور اور سرا کو گوشۂ عافیت بنا کر انسانیت سازی کا نور بکھیر رہے تھے۔

شہادت ٹیپو کے تقریباً بیس سال بعد علامہ عبد الحی بمقام بنگلور پیدا ہوئے اور علم و ادب کا آفتاب نصف النہار بن کر ابھرا اور تعمیر انسانیت اور اصلاح و تربیت کی تحریک چلائی۔

آپ نے سب سے پہلے فَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ پر عمل پیرا ہو کر گھر کے افراد پڑوسیوں اور خاندانی احباب کو ہشت بہشت رواجر ہندی اور تنبیہ النسا پڑھ کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر عمل کیا طہارت و نماز کی ترغیب دیتے اور شرک و بدعت سے دور رہنے کی تاکید فرماتے تھے آپ کو لڑکپن سے ہی غیر شرعی رسم و رواج، الحاد، بدعات و خرافات سے طبعی نفرت تھی علم دین کا جس قدر اضافہ ہوتا گیا اسی قدر اصلاح و تربیت کا شوق دامن گیر ہوتا گیا وعظ و ارشاد بھی آپ کی فطرت ثانیہ بنتی رہی قرآن و حدیث کا نور اس طرح بکھیرتے تھے خاندانی افراد و پڑوسیوں کی پیشانی پر بل پڑنے کے بجائے ان کے ہونٹوں پر گلہائے تبسم کھلا دیتے، وعظ و ارشاد کی تشنگی پیدا کر دیتے اور وہ لوگ اپنی کوتاہیوں پر پشیمان ہو کر آنسوؤں سے گناہ دھونے لگتے تھے اس دور کے جذبۂ اصلاح و تربیت سے متعلق مولانا قلندر حسین اطہر لکھتے ہیں:۔

"اہلیانِ دیں ناحیہ چہ اقاصی وچہ ادانی بانمار امر بالمعروف و نہی منکر دامن خود را

علماء و اعتقادا چمن چمن پر کردند اکثر مردم لشکر کہ خوگر ریش خشخاش و بے بردت نامی بودند بحکم اعفاء اللحیہ وقص الشوارب بواگذاشت ریش وقص بردت اقامت صوم و صلوٰۃ و اجتناب شرک و بدعات موفق گشتہ خود را براہ شریعت سپردند باایں ہمہ خورد سالگی اشتغال تعلیم و تدریس ہم داشت (دیباچہ حدیقۃ الاحباب از احقر).

اسی دور کا ایک واقعہ پیش خدمت کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ شہر بنگلور کے قلب میں توکل مستان نامی ایک مشہور درگاہ ہے جہاں ہندو مسلم خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے دن رات حاضر ہوتے ہیں اس کا کوئی وقت معین نہیں ہے، شاہ احقر نے دیکھا کہ ایک شخص درگاہ کا طواف کرتے ہوئے سجدے میں گر گیا حضرت احقر اس قبیح حرکت کو دیکھ کر تلملا گئے اس شخص کو دیکھ کر انھیں غصّہ بھی آیا اور رنج بھی ہوا اس شخص کا بے چینی سے انتظار کرتے رہے جب وہ باہر آیا تو نہایت نرمی و ملائمت سے گفتگو شروع کی، یہ بندہ عمر میں آپ سے بہت چھوٹا ہے اگر آپ کے خاطر عاطر پر بار نہ ہو اور اگر اجازت ہو تو ایک شے پر بات کرنے کی جرأت کرے گا، اس شخص نے کہا بیٹا! عقل سے بزرگی ملتی ہے عمر سے نہیں تو آپ نے کمال عجز و انکساری سے کہا کہ دنیا کی ساری نعمتیں خالق کائنات کی عنایت کردہ ہیں اور ظاہر ہے یہ سر جو جسم کا بادشاہ ہے کائنات کے بادشاہ کے سامنے ہی جھک سکتا ہے وہی وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے اور عبادت و سجدہ کا بھی وہی مستحق ہے ہم ان بزرگوں کی تعظیم ایصال ثواب و دعا سے کر سکتے ہیں یہ سجدہ کے لائق نہیں سجدہ کرنے کا مقام اس درگاہ کے روبرو واقع شدہ مسجد ہے، ہمارے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام پیغمبروں کے سردار ہیں ان کے روضۂ اطہر کا طواف و سجدہ حرام ہے تو ہم کسی اور کا طواف و سجدہ کیسے کر سکتے ہیں؟ اس شخص کے دل پر اس نوخیز کی بات تیر کی طرح اثر کر گئی اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اس گناہ عظیم سے بچنے کا وعدہ کیا پھر توبہ کی اور شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت چاہا۔

درس حدیث: وعظ و تذکیر کے سلسلہ میں اس دور کا ایک اور واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ لڑکپن کا زمانہ تھا عوام میں جرأت مندانہ اقدام کی ہمت بھی نہیں تھی مگر جذبہ اصلاح نے انھیں خاموش رہنے نہیں دیا عوام کی غیر شرعی حرکات، خواص کی لاپرواہی اور نوجوانوں کی کج روی سے آپ بے چین ہوتے گئے آپ کے ذہن میں ایک اور طریقہ کار ابھر آیا آپ نے رمضان شریف کی مبارک ساعتوں میں

عصر اور مغرب کے درمیان ہر دن پانچ پانچ احادیث حفظ کرنا شروع کیا دوران درس وتدریس ان احادیث کی تشریح و توضیح کی کھوج لگاتے رہے پھر محلّہ کی مسجد میں بعد نماز عشا و تراویح آسان زبان میں مصلیوں کو درس حدیث دینا شروع کیا لب ولہجہ سلیس و دلکش تھا احادیث کے اسرار و رموز بیان کرتے رہے اس طرح پُر خلوص جذبۂ اصلاح اور عام فہم پیرایۂ زبان سے سامعین کا حلقہ وسیع ہوتا گیا تشنگانِ رشد و ہدایت مختلف مساجد سے درس حدیث میں شریک ہونے لگے مصلیوں کی مسلسل خواہش و گذارش سے مختلف مساجد میں بھی نماز فجر و ظہر کے بعد درس حدیث کا سلسلہ شروع ہو گیا آسان تر زبان میں علمی مسائل ہوتے رہے اور یہ سلسلہ بیسیوں سال تک جاری رہا۔

علوم متداولہ کی تکمیل کے دوران صحابۂ کرام تابعین و تبع تابعین اور علمائے سلف صالحین کے سلاسل سے انتساب کی سعادت بھی حاصل کی شاہ ولی اللہ، شاہ عبد الحق اور قطب ویلورؒ جیسے محدثین اور صوفیا سے استفادہ کا شوق بڑھتا گیا اس وقت جنوبی ہند میں حضرت قطب ویلورؒ کا آفتابِ علم وعرفان نصف النہار پر تھا تو شمال میں شاہ عبد العزیز محدّث دہلوی پورے ملک کی قیادت فرما رہے تھے علوم ظاہری و باطنی کی دولت لوٹنے کے لیے قریب ترین فخر الواصلین سیّد شاہ عبد اللطیف محی الدّین المعروف بہ قطب ویلورؒ کے آستانہ سے وابستہ ہو گئے اس خانوادۂ علم و معرفت حضرت مکان ویلور سے اکتسابِ فیض کرتے ہوئے خلقِ خدا سے ہمدردی، راست گفتاری، دیانتداری، پاکیزہ اخلاق، صاف ستھری زندگی اور احترام انسانیت کے مختلف طریقے حاصل کیے، شیخ طریقت نے حلقۂ ارادت میں شامل کر کے خرقۂ خلافت و سند وعظ و ارشاد سے مالامال کیا، جس کے بعد حضرت احقرؔ کی زندگی علم وادب کے جہاد کی نظر ہو گئی۔ اس وقت چار قسم کی تحریکیں اپنے شباب پر تھیں، الحاد، مغربیت، شیعیت اور بدعت اوّل الذکر دونوں تحریکوں کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی اور بقیہ دونوں تحریکوں کو ہوا دینے میں دنیادار علمار کا تعاون تھا لہٰذا آپ نے عوام کے لیے زبان اور خواص کے لیے قلم وقف کر دیا آپ کی زبان غیر معمولی حلاوت، روحانی لطافت اور علمی تجربے معمور تھی جس کے کیف آور ساحرانہ زور و شور سے ہزاروں دل مسحور ہوتے رہے اور سامعین پر جذب و کیف کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔

دل کا اس مشرقِ خورشید عرفاں　　زباں گویا ضیاءِ شمعِ ایقاں
نصائح برزباں جب کھولتا تھا　　فرشتہ ہے کہ موتی رولتا تھا
جو ذکرِ شادی و غم لب پہ آیا　　تماشا برق و باراں کا دکھایا

(دیباچہ جنان السیر از احقر)

لب جب تذکیر میں وہ کھولے ہیں　　تازہ تازہ شگوفے پھولے ہیں
کیا کہوں کیا وہ منہ سے بولے ہیں　　درِ مکنوں صدف سے رولے ہیں
انجمن میں جب کہ وہ آیا　　یک دو لاکھ میں نظر آیا
من گیا جب کہ اس نے دی آواز　　پردۂ گوش تھا کہ پردۂ راز
صدر ہے یا خزینۂ اسرار　　جس سے نکلے ہے لولوئے شہوار

(دیباچہ جواہر التفسیر از احقر)

تھے فدا ان کے وعظ پر واعظ　　مہر انجم نثار عبد الحی
گلشنِ ملّتِ محمدؐ میں　　نخل پُر برگ و بار عبد الحیؒ

(مولانا شہاب الدین سلیم دہلوی)

علّامہ عبد الحی احقر بنگلوری کو عنفوانِ شباب سے ہی شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبد العزیزؒ اور حضرت سیّد احمد شہید رحمہم اللہ سے گہری عقیدت تھی اس سلسلہ سے منسلک ہونے کا اشتیاق بھی تھا اس تحریک کے خلفاء کبار میں جناب فاروق عمری خلیفہ، مولانا سید محمد علی واعظ رامپوری جو حضرت سید احمد شہیدؒ کے خلیفۂ خاص تھے اور میر احمد علی دہلوی مرید شاہ عبد العزیز اور شاگرد شاہ رفیع الدین و خلیفہ سیّد احمد شہیدؒ تھے ان سب سے آپ نے ربط پیدا کیا احادیث نبوی اور سلاسل صوفیہ کی اجازت حاصل کی ظاہر ہے شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ نے مشکوٰۃ المصابیح، بخاری شریف اور باقی صحاح ستہ کی اجازت حضرت شیخ احمد سرہندی سے حاصل کیا تھا جس کا تفصیلی ذکر قول جمیل میں ہے۔ علّامہ احقر نے اپنی کتاب فیض البخاری میں اس کی تفصیل پیش کی ہے۔

معیارِ خطابت:۔ علّامہ احقر اپنے دور میں فن خطابت کے مجتہد اعظم تھے، مسند پر

آتے ہی سامعین پر باوقار نظر ڈالتے تھے آپ کی شخصیت پر نظر پڑتے ہی سامعین پر سکتہ چھا جاتا تھا حمد وصلوٰۃ کے بعد موضوع کی تمہید باندھنے لگتے اپنے موضوع کی درجہ بندی میں ان کا اپنا خاص امتیاز تھا آیات کریمہ کی تشریح احادیث کے اسرار اور مناسب حکایات کے ذریعہ سامعین کی تشنگی کو تیز کرتے جاتے تھے عربی فارسی اور اردو اشعار مناسب طور پر استعمال کرتے تھے، اشعار ترنّم سے پڑھتے، کبھی کبھار اشعار دہراتے ہوئے آدھا مصرع چھوڑ دیتے تھے بقیہ حصّہ پر کرنے کے لیے سامعین کو چونکا دیتے تھے، کتاب و سنّت پر گہری نظر تھی اولیاء عظام وعلماء کبار کے حالات وخدمات پر کافی عبور تھا بلکہ اس صنف خاص سے فطری لگاؤ تھا مکارم اخلاق کے نکہت ہائے پوشیدہ وا کرنے میں انھیں بصیرت افروز ملکہ حاصل تھا عام معاشرتی امراض پر گہری نظر تھی بدعات و ضلالات کی ضرب کاری کے علاج پر ید طولیٰ تھا، دینی تساہل کے بحران سے واقف تھے اس تساہل پسندی کے مختلف الاثر زاویوں سے باخبر تھے، فن خطابت سے متعلق ان کے اپنے چند اصول تھے فرماتے ہیں:۔

خطیب کے لیے سب سے پہلے خلوص نیت لازم ہے اپنے علم پر باعمل رہنا ضروری ہے خود پر اور خاندانی افراد کی اصلاح پر خاص توجہ ہو، مشہور واعظوں کے اسلوب سے واقف ہونا چاہیئے، بے غرض اور منکسر المزاج ہو، یہ بھی ضروری ہے کہ حلیم و باوقار رہے اور خلیق وملنسار بھی، زبان پر مہارت ہو، خطیبانہ معیار پر فصاحت وبلاغت کے اصول برتتے عبارت آرائی سے ہرگز مقصود نہ رہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں:۔

وعظ ہے اک علاج روحانی — پہلے لازم رہے مرض دانی
مرض پہچان کے دوا دینا — کام ہوگا طبیب حاذق کا

فذکر ان نفعت الذکر قرآنی اصول ہے۔

لوگ جب تک نہ خوب ہوں مائل — وعظ اور پند میں نہ ہوں غافل
اور امید قبول نہ ہوے جہاں — کرے ہرگز نہ وعظ گوئی وہاں
محفل آرائی آپ بھی نہ کرے — بلکہ جا آپ بھی اس سے وعظ سنے
اور جس جا میں ایک واعظ ہو! — صاحبِ حکمت و مواعظ ہو!

علاّمہ احقر نے ڈیڑھ سو سال پہلے جن اصولوں کو اپنایا تھا وہ آج بھی قابل تقلید و لائق تحسین ہیں آپ کے پاس مستند واعظ وہ شخصیت ہے جو اخلاص پرور، عالم باعمل، کتاب و سنّت کا ماہر، انبیاء و اولیاء، صحابہ و سلف صالحین کے واقعات سے واقف اور حلیم و بردبار ہو، معاصر واعظین سے خیر سگال ہو خود نمائی سے پرہیز کرے، عام کوچہ گردی سے مجتنب رہے تکبر کو پاس نہ آنے دے، زبان میں حلاوت و طلاقت ہو، آسان اور دلنشیں بات ہو۔

علاّمہ احقر علمائے خیر کی دور بینی اور علمائے شر کی سازشوں سے واقف تھے انگریزوں کی فریب کاری عقل سوز، ہوس پرستی، ملحدوں کی جعل سازی اور مبتدعین کے مذموم رسومات دور رس نتائج سے واقف تھے۔ علم و عرفان کی باریک بینی، اسرار و رموز کی نکتہ رسی اور استنباط احکام، دقیقہ سنجی میں فن خطابت کے فلک پیما مجتہد تھے مولانا قلندر حسین فرماتے ہیں۔

جس مکاں فرماتے ہیں وہ صاحب اسرار وعظ — اک سماں بنتی ہے اس جا از زمیں تا آسماں
کر ساعت کلمہ پڑھتے ہیں در و دیوار وعظ — گونجتا ہے آسماں صلے علی کے شور سے
معرکہ میں بزم کی بن گئی تلوار وعظ — صورت مذبوح غلطاں ہے ہر اک فرد بشر

مولانا غلام علی شوکت اپنی کتاب شوکت الموعظ میں لکھتے ہیں۔

شمع دکن کی ان کو کہیں ہے بجا — جس سے گھٹی شرک کی ساری گھٹا
واعظ یکتائے زمانہ ہیں وہ — صوفی و صافی یگانہ ہیں وہ

حضرت اطہر دیباچہ فیض البخاری میں فرماتے ہیں:

وہ مذکر کہ جس کی محفل میں — درد و سوز و بکا زاری ہے

ضلع ہاسن کے اک رسالہ دار عبدالعزیز خاں کہتے ہیں:۔

میرے وطن چن رائے پٹنی کے باہر جلیل نامی ایک چلہ گاہ تھی، ہر جمعرات مرد و عورتوں کا ہجوم جمع ہوتا تھا، عورتیں ڈھول بجاتی اور گاتی تھیں طرح طرح کی منتیں اور مرادیں مانگی جاتی تھیں، چلہ پرستی کا یہ سلسلہ مدّت دراز سے جاری تھا کسی کو چوں و چرا کی جرأت نہ تھی ۱۹۶۴ء میں علامہ احقر کو دعوت دی گئی آپ کے وجد آفریں خطابات کا سلسلہ شروع ہوا، ایمان و یقین کی

دولت لٹانے کے بعد بدعات وخرافات کا ایسا کریہ و نفرت انگیز نقشہ کھینچتے رہے کہ سامعین پر ایک اضطرابی کیفیت پیدا ہوگئی شک وارتیاب کے بادل ذہن سے چھوٹنے لگے چلہ کشی کی ایسی بھیانک تصویر کھینچی کہ وعظ کے بعد لوگ اپنے اپنے گھر دوڑے بیلچے اور کدال لیے چلہ گاہ پہنچے اور اسے اکھاڑ پھینکا۔

سرا کرناٹک ایک مشہور گاؤں ہے کسی زمانہ میں ایک صوبہ کا صدر مقام تھا جو بنگلور کے شمال میں ۱۲۵ کیلومیٹر کی مسافت پر واقع ہے جہاں دہلی اور بیجاپور کے گورنر بھی رہتے تھے شہنشاہ اورنگ زیب کی سات سالہ لختِ جگر گوہر تاج کے مقبرہ کے ساتھ بہت سی تاریخی تعمیرات بھی ہیں وہاں عرب شاہ کا ایک مقبرہ تھا جہاں ایک تصویر لٹکی تھی اس تصویر پر عقیدت کے پھول چڑھانے کے لیے ہمیشہ جم غفیر لگا رہتا تھا اس غیر شرعی حرکت سے متاثر ہوکر علامہ احقر نے ایسے دل شگاف خطبات دیئے کہ محفل میں آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتی تھیں چیخ وپکار کے شعلے بھڑک اٹھتے تھے یہ سلسلہ تین ہفتہ تک جاری رہا تیسرے ہفتہ بعد نماز جمعہ خود مجاور اپنے ساتھیوں کے ساتھ اٹھا اور اس مقبرہ میں لٹکی ہوئی تصویر کو پارہ پارہ کردیا (جواہر التفسیر از احقر ص۱۹)

۱۲۶۸ھ میں بمقام ٹمکور ضلع کرناٹک تعزیہ داری سے متعلق ایک مناظرہ مقرر ہوا جس کی حمایت میں بدعتیوں کے ساتھ برہمن بھی شامل تھے۔ شہر میں بڑے بڑے سائبان کھڑے کئے گئے سامعین میں ہندو مسلم دونوں جمع تھے۔ برہمن پجاریوں سے فلسفہ ومنطقی دلائل پر بحث شروع ہوگئی۔ مناظرہ کے بعد برہمن سرنگوں ہوگئے اور اسلام قبول کیے، ہوا کی دوش پر یہ خبر پھیل گئی اس کے بعد تیام گنڈل، رامن ہلی، تورنکیرہ اور ہاسن میں توبہ واستغفار کا میلہ سا لگ گیا عاشور خانے مسمار کیے گئے تابوتوں کے پرخچے اڑائے گئے۔ رامن ہلی اور تورنکیرہ کے لوگوں نے عاشور خانوں کو مسجدوں میں بدل دیا۔

شہد اذفریں نہ شکر میں نہ شیریں ہے
جو مزہ آپ کی شیرینیٔ تقریر میں ہے
(اطہر)

سروش غیبی کی طرح آپ کے مواعظ و خطبات کا سلسلہ ماہ محرم سے جمادی الآخر تک جاری رہتا تھا روز بروز تازہ مضامین ہوتے تھے دوران وعظ وارشاد طبیعت میں توانائی آتی اور آواز بلند ہو جاتی تھی اثنائے وعظ سامعین سے کبھی کبھی دلچسپ سوالات بھی کرتے تھے۔

"ہنگامہ تو عیطش روکش ہنگامہ محشر سیاد رایام فرخندہ انجام ربیع الاول ہیچ مسجد و مکان و محل و مجلس بکثرت انام و ہجوم خواص و عوام منجبتی ندارد کہ تہید کرسی تذکیرش توان کرد لہذا برشارع عام عرشہائے فراخ آسماں کاخ ترتیب دادہ می شود تا جمادی الأخری سلسلۂ اش ہم چناں مسلسل می باشد (دیباچہ حدیقۃ الأحباب)

حضرت احقر نے اپنے وعظ و خطبات سے غیر اسلامی رسوم وعقائد کا ابطال کیا شیعی باطنی اثرات کی قباحت کا ازالہ فرمایا، غلط متصوفوں کی کجروی سے عوام کو آگاہ کیا، قبر پرستی وجعلی زیارت گاہوں کے تقدس کی بیخ کنی کی، شعبدہ بازی، تعزیہ داری، شیخ سدو کی کڑھائی، پیران پیر کا علم وغیرہ سے جو سیہ کاریاں پیدا ہو رہی تھیں ان کا علاج کیا۔

مقابلہ تو زمانے کا خوب کرتا ہوں
اگرچہ میں نہ سپاہی ہوں نے امیر جنود

آپ کا اسم گرامی مولانا واعظ بنگلوری ہو گیا حتی کہ یہ لقب آپکے اصل نام پر غالب آگیا، اس زبانی جہاد کے ساتھ علمی جہاد کا علم بھی بلند کر دیا، مختلف کتابیں رسائل اور مضامین کا انبار لگا دیا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد، سیرت و مناقب، خطبات و اصلاح رسوم پر آج بھی ان کا گراں قدر ذخیرہ موجود ہے، زبان کی لطافت و شیرینی، اسرار و رموز کی گرہ کشائی، مطالب کی نکتہ سنجی استحکام احکام و اسرار شریعت کی دقیقہ سنجی آیات و احادیث اور قصص و واقعات سے قارئین کے عقائد کا نفسیاتی علاج کرتے تھے ان کے مجروح عقائد کی اصلاح کی، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ آپ کے دل پر غیب سے ریزش ہو رہی ہے، جواہر التفسیر، فیض البخاری، حدیقۃ الأحباب، تذکرۃ المحدثین تذکرۃ المجتہدین، روضۃ الابرار، حدیقۃ الابرار، شہادت نامہ، تنبیہ العوام، تنبیہ الغافلین، حکمت رمضان، تشہیر براۓ بہار گلشن، تذکرۃ الأولیاء، زاد آخرت، کلید معرفت، رد الملحدین وغیرہ کتابوں کا سدا بہار گلشن تیار کر دیا۔

آپ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ان کے انقلاب آفریں مواعظ وخطبات ہیں، ان کی ذہانت وصداقت سے وعظ وارشاد میں طلسماتی سماں بندھ جاتا تھا، وعظ وارشاد کی شہرت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، لوگوں کے بار بار اصرار پر مدراس، ویلورم، تنجاور، وانمباڑی، چتور، ادھونی، بلہاری، ہر اٹمکور، ہاسن، میسور اور بنگلور سال بھر یکے بعد دیگرے شہروں میں وعظ وارشاد کے بعد توبہ واستغفار کا بازار گرم ہوجاتا تھا، اکثر تذکیر وخطاب کے بعد مجلس وعظ سیاہ کاریوں پر تأسف، آہ وبکا کا ماتم کدہ بن جاتی تھی۔

مولانا واعظ بنگلوری کے مواعظ وخطبات دلکش وہوشربا تو تھے مگر فرضی قصّوں اور پر تکلّف جملوں سے پاک تھے، قصّہ کہانیوں سے یکسر نفرت تھی، آپ نے آیات واحادیث اور سیرت کی روشنی میں اصلاحی بیڑا اٹھایا تھا، حقوق اللہ وحقوق العباد کی وضاحت کی جاتی، سلف صالحین کے پاکیزہ ومنزہ زندگی کے نقوش وروزمرہ حالات سے محفل کا رنگ بدل جاتا تھا، خلاف شریعت پر ابھارنے والے علمائے سو وصوفی نما شخصیتوں کے جسم سے ان کی ساختہ وپرداختہ درویشی کا لبادہ اتار کر حقیقت کا انکشاف کرتے تھے، عوام میں سال بھر مروجہ رسوم وبدعات اور خرافات کے نفرت انگیز نقوش مثلاً حاملہ وسوگوار عورتوں کی بدعقیدہ رسومات اور ان کے برُے نتائج کی بھیانک تصویر کشی کرتے تھے۔

آپ کے مواعظ نثر ہی نہیں بلکہ نظم میں بھی ہوتے، جس سے عوام کی خاص دلچسپی بھی دکھائی دیتی تھی مثلاً:

بولتے ہیں اس طرح اکثر عوام	کہ جو ہیں شرک کفر وبدعت کے کام
باپ دادا میں ہمارے تھا رواج	کیوں کریں ہم ترک ان کاموں کو آج
واہ کیا معقول ان کا قول ہے	ایسی قوموں پر سدا لاحول ہے

(تنبیہ الغافلین)

بے اولاد عورتوں کا نہاوہ، ناریل پھوڑنا، لیمو کاٹنا، مرد بچّوں کو بال رکھوانا، مکتب وشادی کے بے ہودہ رسومات مثلاً ہلدی، مسی، ومہندی کے رسوم سہرا وغیرہ خلاف سنّت

بتا کر اسلامی معاشرے، عورتوں و مردوں کے کافرانہ عادتوں کی شباہت، معاشرتی امتزاج کی عکاسی ممنوع قرار دیتے ہوئے ان سے گریز و پرہیز پر اکسایا اور ایمانی دولت کھونے کا پیش خیمہ بتایا اور آخرت خراب کرنے کا اندیشناک ذریعہ بتایا۔

ان سب آثار خالدہ کے ساتھ ترجمہ خطبات حرمین شریفین کے نام سے جمعہ کے اردو خطبات پر ایک کتاب بھی شائع کی جس میں حمد و صلوٰۃ، تلاوت و شہادت، وصیت و نصیحت وغیرہ امور کو عربی زبان میں بحال رکھ کر اردو و عربی مخلوط خطبہ جمعہ کو رواج دیا جو دور حاضر میں بھی ملیشیا فلپائن، برما و سیلون بلکہ عرب ممالک کے اردو داں حضرات کے محلوں کی مسجدوں میں یہ خطبات جاری ہیں امر بالمعروف و نہی عن المنکر، اعمال صالحہ کی ترغیب و افعال شنیعہ کی ترہیب اصلاح معاشرت کے صحیح اصول، اخلاق انسانی کے اعلیٰ آدرش صحاح ستہ اور قرآنی آیات کی روشنی میں واضح کی ؟

مولانا واعظ درحقیقت ایک زندہ دل ادیب و خطیب مؤرخ و سیرت نگار بھی تھے،

به منزل کوش مانند مه نو ! | درین نیلی فضا هر دم فزوں شو
مقام خویش اگر خواهی دریں دیر | بہ حق دل بند و راه مصطفیٰ رو

طفیل مدنی

نعت

خوشا کہ داعیِ توحیدِ کبریا ہوں میں
زہے نصیب کہ مداحِ مصطفیٰؐ ہوں میں

مجھے نہیں ہے یہ دعویٰ کہ پارسا ہوں میں
مگر یہ سچ ہے کہ شیدائے مصطفیٰؐ ہوں میں

نہ کیوں ہو دل میں مرے عشقِ احمدِؐ مرسل
کہ اپنے اہلِ دل اسلاف کی دعا ہوں میں

نہ کیسے ذات میں میری ہو کیمیا کا اثر
رسولِ برحق و برتر کی خاکِ پا ہوں میں

غلامِ احمدؐ مرسل، فدائے آلِ نبیؐ!
اسی سے جان لیں اہلِ نظر کہ کیا ہوں میں

کہو اجل سے ذرا دیر انتظار کرے
کہ محوِ دیدِ سراپائے مصطفیٰؐ ہوں میں

الٰہی کر دے عطا کچھ صفاتِ مرتضوی
کہ یہ تو کہہ سکوں از نسلِ مرتضیٰ ہوں میں

ذرا ٹھہر کے چلو رہروانِ ملکِ عدم
تمہارے پیچھے ہی پیچھے تو آ رہا ہوں میں

ہمیشہ ہوتا رہا جس پہ فضلِ ربِّ کریم
وہی طفیلؔ خطاکار و بے نوا ہوں میں

رضوان اللہ فاروقی
نئی دہلی

فغاں اے افغاناں فغاں!

اے ہمالہ کتنا خوں آشام ہے تیرا وجود
خونفشاروں سے گل ولالہ کی ہے ہست و نبود

ہر بُنِ گل کو غذا ہے استخوان و پوست سے
نوکِ خنجر جھانکتی ہے آستین دوست سے

مخملِ صحرا پہ گل بوٹے ہیں خوں کی پھلجھڑی
کیسۂ بارود ہے ہر گل کی گویا پنکھڑی

کیا لہو ارزاں ہوا ہے! آبشاروں میں لہو
کوہساروں پر لہو ہے سبزہ زاروں میں لہو

جو صبا لاتی تھی بوئے گل وہ راکٹ بار ہے
عشق پیچاں اب نہیں ہے گولیوں کا ہار ہے

اوٹ میں بادل کے کوہ سیم و زر پنہاں نہیں
اب قیامت خیز بم ہیں ترکش و پیکاں نہیں

یا خدا کس کی نظر ہے اس فراز کوہ پر!
کس کی حرفت کارفرما کا شمر تا کاشغر!

جبہ و دستار افغاں کیا گرو رکھے گئے؟
گولیاں تسبیح میں، محراب میں حربے نئے

کیا ہوا؟ روپوش سارے روئے زیبا ہو گئے
رخصت اے دانش کہ اب افغان دانا سو گئے

سورما، دشمن کے قابل، خودکشی کرنے لگے
جو سپہ سالار تھے وہ کو بہ کو مرنے لگے

کیا ہوا شہباز کو؟ مور و مگس تک آ گئے
شل ہوئے بازو تو کیا دام و قفس تک آ گئے

کیا ہوا؟ شیروں کا دیں شغلِ شغالاں ہو گیا
اپنی بربادی کا ساماں ہائے افغاں ہو گیا

کیا ہوا؟ دنیا کے سارے کیا ہوئے اسلامیاں؟
کیا ہوا عزت کو انکی؟ بیچ کھایا تو کہاں

کیا نظر آتا نہیں شعلے کہاں تک آ گئے
غافلو! دوڑو! تمہارے درمیاں تک آ گئے

ڈاکٹر محمود الحسن عارف

حرمین شریفین کے سفرناموں پر

بین الاقوامی سیمینار

منعقدہ: ۲۴،۲۵ر اکتوبر ۱۹۹۷ء کی روداد

پاکستان میں رابطۂ ادب اسلامی کی شاخ (اقلیم) کا قیام ۱۹۹۵ء میں عمل میں آیا۔ رابطہ کے ناظم اعلیٰ مولانا سید محمد رابع نے ڈاکٹر ظہور احمد اظہر (صدر رابطہ) کے نام پاکستان میں رابطے کی سرگرمیوں کو منظم کرنے کی خواہش ظاہر کرتے ہوئے انھیں پاکستان اور افغانستان پر مشتمل اقلیم کا صدر مقرر کیا اور ڈاکٹر تحسین فراقی کو ان کا معاون، ڈاکٹر صاحب نے راقم الحروف کو اس کا اجلاس بلانے کی ہدایت کی۔ چنانچہ مئی ۱۹۹۶ء کو فہرست میں موجود تمام ارکان کا اجلاس طلب کیا گیا، تمام ارکان نے پاکستان میں اس تنظیم کے قیام کو سراہا اور باتفاق رائے راقم الحروف کو اس کا جنرل سکریٹری (ناظم) مقرر کیا۔ ایک اور اجلاس میں حافظ فضل الرحیم کو اس کا سینئر نائب صدر مقرر کیا گیا۔

اکتوبر ۱۹۹۶ء میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کی مرکزی کونسل نے اکتوبر ۱۹۹۷ء میں لاہور میں "حرمین شریفین کے سفرناموں" پر ایک بین الاقوامی علمی مذاکرہ کرانے کی تجویز منظور کی چنانچہ مرکز (ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ بھارت) سے عنوان کی منظوری کے بعد، دیگر انتظامات مکمل کر لیے گئے اور لاہور میں ۲۴، ۲۵، ۲۶ر اکتوبر ۱۹۹۷ء کو عظیم الشان طریقے پر بین الاقوامی سیمینار منعقد ہوا، اس سیمینار میں قریباً دس اسلامی ممالک سے مندوبین نے شرکت فرمائی۔ سیمینار کے پانچ اجلاس ہوئے۔

جن میں سے ہر ایک کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ پہلا اجلاس (نشست اوّل)

یہ اجلاس (نشست) الحمراء کے ہال نمبر ۲ میں ہوا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی، جو گذشتہ شام ہی بھارت سے لاہور پہنچے تھے اور اس تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ ساڑھے نو بجے الحمراء ہال نمبر۲ میں تشریف لے آئے، صدر مجلس سردار فاروق احمد خاں لغاری بھی قریباً ساڑھے دس بجے الحمراء ہال میں تشریف لے آئے، اجلاس کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز کیا گیا۔

اس موقع پر تلاوت کلام پاک و ترجمہ پیش کرنے کی سعادت قاری سیّد صداقت علی نے حاصل کی، انھوں نے سورۂ الرحمٰن کی ابتدائی آیات کی تلاوت نہایت خوبصورت انداز میں فرمائی جن میں علم و دانش کو عطیۂ نعمت الٰہی قرار دیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ یہی آیات عالمی رابطہ ادب اسلامی کے "مونوگرام" پر رقم کی گئی ہیں۔

ہدیۂ نعت سید محبوب علی ہمدانی نے پیش کیا۔ جس کے بعد صدر رابطہ ادب اسلامی پاکستان ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا، جس میں انھوں نے صدر مملکت سردار فاروق احمد خاں لغاری، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور دیگر مہمانوں کی اس سیمینار میں آمد کا خیر مقدم کرتے ہوئے، سیمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور عالمی رابطہ ادب اسلامی کے اہداف کا تذکرہ کیا۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے، جو مولانا علی میاں صاحب کے ہمراہ گذشتہ روز ہی لاہور میں تشریف لائے تھے، خیر مقدمی کلمات ارشاد فرمائے، جس میں انھوں نے پاکستان میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کی کارکردگی کو سراہا اور اس علمی مذاکرے کے موضوع اور اس سے متوقع نتائج کے متعلق اظہار خیال فرمایا، اس کے بعد عالمی رابطہ ادب اسلامی کے بانی صدر اور اس نشست کے مہمان خصوصی مولانا ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم نے اس سیمینار کی مناسبت سے فی البدیہہ تقریر فرمائی، جس میں آپ نے عالمی رابطہ ادب اسلامی کی پاکستان شاخ کو اس سیمینار کے انعقاد پر

مبارک باد پیش کی اور رابطہ ادب اسلامی کے پس منظر کو اجاگر کرتے ہوئے دعوت اسلامی کے طریقۂ کار پر مختصر مگر جامع گفتگو فرمائی۔

مولانا نے اپنے خطاب میں لاہور میں اپنی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ اس شہر میں کئی مرتبہ آچکے ہیں، یہ شہر ان کے محبوب شاعر علاّمہ اقبالؔ کا شہر ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ انھوں نے حکیم الامت علاّمہ اقبالؔ کی ایک نظم کا عربی ترجمہ سولہ برس کی عمر میں کیا تھا، جب وہ علاّمہ اقبال سے ملے تو انھیں اس پر یقین نہ آیا تو علاّمہ نے ان سے بہت سے سوال کیے، جس کے بعد انھیں یقین ہوگیا۔ اس طرح میری اقبالؔ سے شناسائی ہوئی اور بڑھتی گئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ سعادت بخشی کہ میں اقبال کو عرب دنیا میں متعارف کراؤں، اللہ کا شکر ہے کہ ان کی کتاب ''روائع اقبال'' کو عرب دنیا میں پذیرائی نصیب ہوئی۔ بعد ازاں انھوں نے سورۃ النحل میں مذکور آیت مبارکہ سے ادب اسلامی کی حقیقت و ماہیت پر روشنی ڈالی۔

اس نشست کے دوسرے مہمان خصوصی جسٹس میاں محبوب احمد صاحب چیف جسٹس وفاقی شرعی عدالت پاکستان تھے۔ جسٹس صاحب نے نہایت خوبصورت الفاظ میں اپنا مقالہ پیش کیا اور مختلف کتابوں سے اقتباسات پیش کرتے ہوئے حرمین کے سفرناموں سے متعلق دلچسپ تأثرات بیان فرمائے۔

انھوں نے فرمایا کہ ہر سال ۲۵ لاکھ مسلمانوں کا حج کے لیے جانا اس بات کی دلیل ہے کہ ملّت اسلامیہ کا مرکز سے رشتہ مضبوط ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ پوری اُمّت کو عالم کفر کے مقابلے میں متحد کیا جائے اور حج کو مسلمانوں کی اقوام متحدہ میں بدل دیا جائے، انھوں نے کہا کہ مرکز گریز اور اسلام مخالف قوتوں کو دندان شکن جواب دینے کے لیے درِ مصطفٰے سے کامل وابستگی کی ضرورت ہے، یہی وہ چراغ ہے جس سے کفر کی ظلمتیں لرزاں ہیں۔

تقریب کے آخر میں صدر مملکت نے خطبۂ استقبالیہ ارشاد فرمایا جس میں انھوں نے پاکستان میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کے قیام اور اس کی ادبی سرگرمیوں کو سراہتے ہوئے مستقبل میں انھیں کام کرنے کی نوعیت اور طریقہ کار سے متعلق چند مفید مشورے بھی دیئے۔ صدر مملکت نے

فرمایا کہ عالم اسلام کو اس وقت ایک زبردست علمی اور فکری تحریک اٹھانے اور ثقافتی انقلاب لانے کی ضرورت ہے، اس سے عالم اسلام ایک طرف تو حقیقی اسلامی تعلیمات سے قریب تر ہو جائے گا، دوسری طرف اس سے دنیا کے سامنے اسلامی تعلیمات پرکشش انداز میں پیش کی جا سکیں گی، جو انسانی اذہان وقلوب پر اثر کر سکیں گی۔۔۔ انھوں نے عالمی رابطۂ ادب اسلامی کے اغراض ومقاصد کو وقت کی اہم ترین ضرورت قرار دیتے ہوئے کہا کہ ایسا ادب جو انسانیت کے عظیم تر مقاصد کی آبیاری کرنے کے بجائے، محض ذہنی لذّت اور تفریح تک محدود ہو جائے، وہ نہ تو پائیدار ہوتا ہے اور نہ ہی اسے اعلیٰ ادب قرار دیا جا سکتا ہے۔ ادب "تعمیر انسانیت کا وسیلہ ہے، اور جب شاعری یا نثر تعمیری مقاصد سے روگردانی کرنے لگے تو اسے ادب کا نام نہیں دیا جا سکتا، آج بظاہر دنیا سائنسی اور مادی ترقی کی معراج پا چکی ہے، مگر جن معاشروں میں مادی ترقی عروج پر ہے وہ شدید اخلاقی زوال میں مبتلا ہیں اور روحانیت سسکیاں لے رہی ہے، انھوں نے کہا کہ اس وقت دنیا میں انسان کی ایک خوفناک جنگ جاری ہے اور عالم اسلام اس سے نظریں نہیں چرا سکتا۔ کیوں کہ عالم اسلام اس وقت اپنے معاشرے کی تشکیل نو میں مصروف ہے اس لیے کہ ایک طرف تو مغربی میڈیا کی یلغار ہے اور دوسری طرف اشتراکیت کے عملی خاتمہ کے بعد مغرب اسلام کو اپنا حریف سمجھنے لگا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اسلامی معاشرے میں داخلی طور پر توڑ پھوڑ شروع ہے، ان تمام مسائل کے حل کے لیے عالم اسلام کو اپنی منزل کا از سر نو تعین کرنا ہے۔

صدر مملکت کے خطبۂ صدارت کے بعد، صدر صاحب کی اس تقریب میں آمد کی یادگار کے طور پر مولانا ابوالحسن علی ندوی نے صدر مملکت کو اپنے دست مبارک سے شیلڈ پیش کی، اور پھر صدر مملکت نے مولانا کو شیلڈ دی۔ تقریب کا اختتام دعا پر ہوا۔ دعا مولانا علی میاں صاحب نے فرمائی۔

اس تقریب کی میزبانی کے فرائض ڈاکٹر محمد خورشید الحسن رضوی نے انجام دیئے، جبکہ اسٹیج پر صدر مملکت اور مولانا علی میاں صاحب کے ساتھ، جسٹس میاں محبوب احمد صاحب، گورنر پنجاب

مسٹر شاہد حامد صاحب، سید محمد رابع حسنی ندوی، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، میاں مصطفیٰ صادق (مدیر اعلیٰ روزنامہ وفاق) احمد حسین میاں (سابق صدر چیمبر آف کامرس لاہور) اور راقم الحروف اور ڈاکٹر محمد خورشید الحسن رضوی تشریف فرما تھے۔

عالمی رابطہ ادب اسلامی نے اس موقع پر ہال نمبر ۳ کی گیلری میں کتابوں، خصوصاً "حرمین شریفین کے سفرناموں پر ایک خوبصورت نمائش کا بھی اہتمام کیا تھا، صدر مملکت نے تقریباً ۱۲.۳۰ بجے اس کا افتتاح کیا۔ نمائش کے انتظامات کی ذمہ داری مسٹر اورنگ زیب ملک لائبریرین پنجاب بک ٹرسٹ نے احسن طریقے پر نبھائی۔

روداد اجلاس نشست دوم: ۲۴ر اکتوبر ۱۹۹۷ء شام ۴ بجے تا ۷ بجے

عالمی رابطہ ادب اسلامی کے سیمینار کی دوسری نشست شام ۴ بجے عامر ہوٹل کے ہال میں منعقد ہوئی۔ اس کی صدارت راجہ محمد ظفر الحق وفاقی وزیر برائے مذہبی امور نے فرمائی، جو اس کے لیے خصوصی طور پر اسلام آباد سے تشریف لائے تھے، جبکہ مہمان خصوصی مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی تھے۔ جن کے ساتھ پروفیسر عبدالقیوم صاحب کے صاحبزادے اور استقبالیہ کمیٹی کے رکن میجر (ر) زبیر قیوم، ڈاکٹر محمود احمد غازی (وائس پرنسپل بین الاقوامی یونیورسٹی، اسلام آباد) ڈاکٹر ابوبکر صدیق (ڈھاکہ یونیورسٹی، ڈھاکہ) اور مولانا فضل الرحیم صاحب تشریف فرما تھے۔

کاروائی کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا، قاری سعید احمد (استاد جامعہ اشرفیہ) نے تلاوت فرمائی۔ اس کے بعد مقالات کا سلسلہ شروع ہوا، پہلا مقالہ پروفیسر ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی (ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز و ہیومینٹیز علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی) نے پڑھا۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا "اولین سفرنامہ حجاز جدید تحدیات کے تناظر میں" اس مقالے میں فاضل مقالہ نگار نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر ہجرت اور سفر حجۃ الوداع کو جدید تحدیات کے تناظر میں موضوع سخن بنایا تھا۔ اور نہایت عمدہ پیرائے میں جدید مسائل کے حل کے لیے عمدہ استنباطات پیش کیے۔

پھر "حرمین کے اردو سفرناموں کے علمی و ادبی اسالیب" کے عنوان سے ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی

(مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے اُردو ادب میں حرمین کے سفرناموں کے جو مختلف اسلوب رائج اور معروف ہیں ان پر اظہار خیال فرمایا۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی (شعبۂ اُردو ہندو یونیورسٹی بنارس) کے مقالے کا عنوان تھا " اپنے گھر سے بیت اللہ تک ایک منفرد سفرنامہ" فاضل مقالہ نگار نے مولانا ابوالحسن علی ندوی کے سفرنامے کو اپنی تحقیق کا محور بناتے ہوئے اس کے اسلوب بیان پر گفتگو کی، اور اس میں موجود عمدہ پہلوؤں کو اجاگر کیا۔

ماہر اقبالیات اور شعبۂ اقبالیات جامعہ پنجاب کے صدر پروفیسر ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ نے علامہ اقبال کے تخیلی سفرنامۂ حرمین پر مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر صاحب نے علامہ اقبال کی کتاب ارمغان حجاز سے مختلف اقتباسات پیش کرتے ہوئے اسے ایک حقیقی سفرنامے کے روپ میں پیش کرتے ہوئے شاعر اسلام علامہ محمد اقبال کی شاعری ان کے انداز بیان، ان کی قوت متخیلہ اور ان میں موجود تخلیقی صلاحیتوں کو خراج تحسین پیش کیا۔

ایک مصری اسکالر ڈاکٹر جلال السعید حفناوی (جواہر لال یونیورسٹی، دہلی) نے "ابن جبیر الاندلسی اور عبدالماجد دریابادی کے سفرنامے قدیم اور جدید دور کا تقابلی جائزہ" کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر صاحب عربی الاصل ہونے کے باوجود بڑی روانی سے اُردو بولتے ہیں اور یہ مقالہ ان کی اردو دانی کا واضح ثبوت ہے۔

تقریب کے آخر میں تقریب کے مہمانِ خصوصی راجہ محمد ظفر الحق صاحب نے صدارتی کلمات میں اس سیمینار کے علمی موضوع کے متعلق اور مقالہ نگاروں کے، علمی اور فکری اسالیب کے متعلق اظہار خیال فرمایا۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ عالمی رابطہ ادب اسلامی اپنے علمی مذاکرے میں خصوصاً نوجوانوں کو شامل کرے۔ انھوں نے اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ وزارت مذہبی امور پاکستان اس سیمینار کے اخراجات کا ایک حصہ ادا کرے گی۔

راجہ صاحب کو چونکہ ½ ۸ بجے کی پرواز سے واپس اسلام آباد جانا تھا۔ اور رات کو ½ ۸ بجے پرل کانٹی نینٹل میں گورنر پنجاب کی صدارت میں ایک خصوصی تقریب ہونا تھی، اس لیے یہ اجلاس قریباً ½ ۷ بجے ختم کرنا پڑا۔ اس نشست میں راقم الحروف نے "عربی زبان میں حرمین کے

سفرناموں کی ابتدا اور عربی زبان کے قدیم اہم سفرنامے،، کے عنوان سے جو مقالہ تیار کیا تھا اسے پیش نہ کیا جاسکا۔ ۔ ۔ یہ مقالہ مجموعہ مقالات میں شامل ہوگا۔

تقسیم شیلڈز کی تقریب، (پرل کانٹی نینٹل لاہور)

اسی شب رات کو پونے نو بجے پرل کانٹی نینٹل میں تقسیم شیلڈ کی تقریب ہوئی، جس میں گورنر پنجاب محترم شاہد حامد مہمان خصوصی تھے، حافظ فضل الرّحیم کے خطبہ استقبالیہ کا جواب دیتے ہوئے گورنر پنجاب نے فرمایا کہ کائنات میں سب سے اعلیٰ و ارفع مذہب اسلام ہے، اسلام نے عالمی تاریخ میں پہلی مرتبہ مساوات، اخوت اور انسانی بھائی چارہ پر زور دیا ہے، اسلام انسانوں میں کسی بھی قسم کی تفریق اونچ نیچ، یا ذات پات کو یکسر مسترد کرتا ہے، انھوں نے مزید فرمایا کہ آج کی انتشارزدہ دنیا میں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ رسالت مآبؐ کی ان تعلیمات کو سامنے لایا جائے جس میں انھوں نے ہم سب کو انسان کے اصل مقام سے روشناس کرایا۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ اگر ہم اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لیں تو ہمارے معاشرے میں ایسی اخوّت وجود پذیر ہوگی، جو ہمیں ایک ملّت واحدہ میں ڈھال کر ایک جسم کی شکل دیدے گی۔۔ ان حالات میں رابطہ ادب اسلامی جیسے اداروں کا کردار کلیدی اہمیت کا حامل ہے، انھوں نے مزید فرمایا کہ رابطۂ ادب اسلامی ایسے ادارے اس لیے بھی قابل تحسین ہیں کہ یہ ہماری توجہ اس شعبے کی طرف دلاتے ہیں جسے حضور پاکؐ نے مومن کی گم شدہ میراث قرار دیا تھا۔ آج اُمت مسلمہ کی وحدت کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ تمام مسلم ممالک کے ادیب اور دانشور باہم مل کر مسلمانوں کی فکری قیادت کا فریضہ سرانجام دیں۔ اور اسلامی ادب کے ذریعہ مسلمانوں، بالخصوص نوجوانوں کو اسلام کی اعلا تعلیمات اور نصب العین کی جانب راغب کریں۔

اس کے بعد گورنر پنجاب نے وفاقی شرعی عدالت پاکستان کے چیف جسٹس میاں محبوب احمد، رابطۂ ادب اسلامی پاکستان کے صدر ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی وائس چانسلر

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ڈاکٹر حسین صدیقی، عالمی رابطہ ادب اسلامی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمود الحسن عارف، شعبہ عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر خالق دار، شعبہ عربی گورنمنٹ کالج کے سابق صدر شعبہ ڈاکٹر محمد خورشید الحسن رضوی، جامعہ اشرفیہ لاہور کے استاد مولانا محمد یوسف خان، جامعہ نعیمیہ کے مہتمم ڈاکٹر سرفراز نعیمی، خیر المدارس ملتان کے مہتمم قاری محمد حنیف جالندھری، عالمی رابطہ ادب اسلامی کے سینئر نائب صدر حافظ فضل الرحیم، بین الاقوامی سیمینار کے ناظم مہمانداری محمد اکرم کاشمیری، روزنامہ وفاق کے مدیر اعلیٰ اور سینئر رکن استقبالیہ کمیٹی بین الاقوامی سیمینار میاں مصطفےٰ صادق، ناظم جلسہ گاہ اکمل اویسی، ناظم نمائش کتب اورنگ زیب ملک دار العلوم ندوۃ العلماء کے پرنسپل اور عالمی رابطہ ادب اسلامی کے ناظم اعلیٰ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، استاد مدرسہ صولتیہ (مکہ مکرمہ) عبد الحفیظ مکی، اور سعید عنایت اللہ، عالمی رابطہ ادب اسلامی کے نائب صدر ڈاکٹر تحسین فراقی، رکن استقبالیہ میجر (ر) زبیر قیوم اور رکن استقبالیہ و سابق صدر چیمبر آف کامرس احمد حسین میاں کو شیلڈز دیں۔ ۔ ۔ ۔ جس کے بعد دعا ہوئی ۔ ۔ ۔ اور مہمانوں نے کھانا کھایا۔

تیسری نشست

مورخہ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۹۷ء کو عالمی رابطہ ادب اسلامی کے تحت ہونے والے سیمینار کی تیسری نشست بھی عامر ہوٹل کے ہال میں منعقد ہوئی۔ اس کے صدر یادگار اسلاف مولانا ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم تھے اور مہمان خصوصی ڈاکٹر انوار حسین صدیقی (وائس چانسلر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد)۔

اجلاس کی کارروائی تلاوت کلام پاک سے شروع ہوئی جس کے بعد مقالات کا سلسلہ شروع ہوا سب سے پہلے شعبۂ اردو (پنجاب یونیورسٹی) کے ایسوسی ایٹ پروفیسر اور اس نشست کے میزبان ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنا مقالہ پڑھا۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا "مولانا عبدالماجد دریابادی کا سفرنامۂ حجاز" انھوں نے مولانا کے سفرنامۂ حجاز سے مختلف اقتباسات کے حوالے پیش کرتے ہوئے، ان کے انداز بیان کی ندرت اور اس میں موجود جذبوں کو سراہا۔ جس کے بعد

ڈاکٹر امین اللہ وثیر (سابق ڈائرکٹر جنرل وزارت مذہبی امور) نے "قیام پاکستان سے کے چند اردو سفر نامے،، کے عنوان پر مقالہ پیش فرمایا۔ انھوں نے برصغیر پاک و ہند کے اردو زبان میں لکھے گئے چند سفرناموں کو موضوع سخن بناتے ہوئے بیان کیا کہ یہ سفرنامے قدیم ہونے کے باوجود بے حد معلومات افزا ہیں اور ان سے اس دور کی علمی اور سیاسی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔ اگلا مقالہ مولانا سید واضح رشید ندوی (استاد ندوۃ العلماء لکھنؤ بھارت) کا تھا، جس کا عنوان الرحلۃ الحجازیہ ومناہجہا واسلوبہا، تھا،، اس کے بعد ڈاکٹر خالق دار (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ عربی) نے اپنا مقالہ پڑھا، عنوان تھا "رحلۃ ابن جبیر الی الحرمین دراسۃ وتحلیلاً ... ۔

اگلے مقرر ڈاکٹر محمود احمد غازی (نائب صدر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد) تھے۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا "دور جدید کی تحدیات کے تناظر میں ایک منفرد سفر نامہ حج ارمغان حجاز،، انھوں نے شاعر اسلام علامہ اقبال کے منظوم کلام ارمغان حجاز،، میں حکیم الامت کے تخیلی سفر نامہ حجاز میں موجود جدید چیلنجوں کے مقابلے کے لیے مواد پر نہایت عمدہ طریقے پر اظہار خیال فرمایا۔ اس مرحلے پر مولانا ابوالحسن علی ندوی ضعف کی بنا پر اٹھ کر چلے گئے، جانے سے پہلے آپ نے حرمین الشریفین کے سفرناموں کے موضوع پر مختصر مگر جامع خطاب فرمایا۔ اس کے بعد نصف گھنٹے کا وقفہ ہوا، جس کے دوران میں حاضرین کی تواضع چائے سے کی گئی اور اس کے بعد ڈاکٹر انوار حسین صدیقی کی صدارت میں اجلاس جاری رہا۔

اگلا مقالہ ڈاکٹر سید عبدالباری (شعبہ اردو اودھ یونیورسٹی بھارت) کا تھا ان کے مقالے کا عنوان تھا "ماہر القادری بحیثیت سفر نامہ نگار،، کاروان حجاز کی روشنی میں،، ان کے مقالے کو بھی حاضرین نے بے حد پسند فرمایا۔

مولانا نذر الحفیظ ندوی اگلے مہمان مقرر تھے، انھوں نے علی طنطاوی کا سفرنامہ حجاز،، اور مولانا عبدالماجد دریابادی کا سفرنامہ حجاز کا مقابلہ ومطالعہ ،، کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے شیفتہ کا سفر حرمین (مومن خاں مومن کے نام ایک غیر مطبوعہ نادر خط) کے عنوان سے مقالہ پڑھا، جسے مقرر کے خصوصی انداز بیان اور مشتملات کے علمی اور فکری

پہلوؤں کے باعث بے حد سراہا گیا۔

سب سے آخر میں پروفیسر ڈاکٹر عبدالباری (صدر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے رحلۃ الصدیق الی البیت العتیق، کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ جس میں انھوں نے نواب صاحب کے اسلوب بیان پر اظہار خیال فرمایا۔

تقریب کے آخر میں مہمان خصوصی صدر ڈاکٹر انوار حسین صدیقی نے صدارتی خطاب فرمایا، اور انھوں نے عالمی رابطہ ادب اسلامی کے تحت ہونے والے اس علمی مذاکرے کو سراہتے ہوئے کئی مفید تجاویز بھی پیش کیں۔

چوتھی نشست: مورخہ ۲۵ راکتوبر ۱۹۹۷ء وقت ۴ تا ۵ بجے شام

رابطہ ادب اسلامی پاکستان کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے دو روزہ بین الاقوامی سیمینار کی چوتھی نشست ۲۵ راکتوبر ۱۹۹۷ء کو شام ساڑھے چار بجے عامر ہوٹل لاہور کے ہال میں منعقد ہوئی۔ اس نشست کے صدر رابطہ ادب اسلامی ہندوستان کے راہ نما، کاروانِ ادب کے مدیر اور ہندوستان کی معروف دینی درس گاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی تھے۔ مہمانان خصوصی میں سابق وزیر مذہبی امور مولانا سید وصی مظہر ندوی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی شعبہ عربی کے صدر ڈاکٹر عبدالباری ، اور بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے استاذ ظفر احمد صدیقی اور جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کے شعبہ قرأت کے صدر مدرس قاری سیّد رشید الحسن ندوی تھے۔

اس نشست کی میزبانی کے فرائض زاہد منیر عامر (استاد شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور) نے انجام دیئے۔

اس نشست میں شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی کے سینئر مدیر ڈاکٹر محمد امین نے شاہ ولی اللہ کے سفر نامہ حج "فیوض الحرمین"، پر ایک نظر ڈالی، جبکہ ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش، کے شعبہ عربی کے پروفیسر ڈاکٹر ابوبکر صدیق نے "ادب الرحلات الی الحرمین الشریفین" رؤیۃ ادبیۃ و دینیۃ کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔

جامعہ اشرفیہ لاہور کے استاد مولانا محمد یوسف خاں نے "بعض افسانہ نگار اور ناول نگار خواتین کے سفرنامہ ہائے حج" کا جائزہ پیش کیا۔ جسے حاضرین نے بہت سراہا، ممتاز ماہر اقبالیات ڈاکٹر رفیع الدّین ہاشمی نے عبدالرحمٰن عبد کے چار جلدوں پر مشتمل سفرنامے "آنحضورؐ کے نقش قدم پر" کے حوالے سے اظہار خیال کیا۔ مدینہ یونیورسٹی میں عربی کے استاد، جو ان دنوں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں مہمان استاد کے طور پر فرائض انجام دے رہے ہیں، پروفیسر اجتباء ندوی نے نواب صدیق حسن خاں قنوجی اور ان کے سفرنامہ حج پر مقالہ پیش کیا۔ دیگر مقالہ نگاروں میں شعبہ عربی گورنمنٹ کالج فیصل آباد کے صدر ڈاکٹر محمد اسحٰق قریشی (شیخ عبدالحق محدّث دہلوی کی جذب القلوب الی دیار المحبوب اور شیخ رفیع الدّین مرادآباد کا سفرنامہ حجاز: ایک تقابل۔ مولانا سعید احمد عنایت اللہ استاد مدرسہ صدیقیہ مکّہ مکرمہ (ادب رحلۃ الحرمین وتاثیرہ فی حیوۃ المسلمین) اور ڈائریکٹر سیرت اسٹڈیز سیالکوٹ پروفیسر عبدالجبّار شیخ صاحب تھے۔

آخر میں صدر مجلس مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی نے دعا کروائی، جس کے بعد یہ اجلاس اپنے اختتام کو پہنچا۔ ڈاکٹر محمد انعام الحق کوثر نے حرمین کے سفرنامے اور بلوچستان کے عنوان سے مقالہ ارسال کیا تھا، مگر وقت کی کمی کے باعث اسے پیش نہ کیا جاسکا یہ مقالہ مجموعہ مقالات میں شامل ہوگا۔

پانچویں اور آخری نشست مورخہ ۲۵؍اکتوبر ۹۷ء بمقام الحمراء ہال نمبر ۳

دوروزہ بین الاقوامی سیمینار کی اختتامی نشست کی صدارت پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں محمد شہباز شریف نے فرمائی اور اس کے مہمانان خصوصی مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، مفتی محمد حسین نعیمی (پرنسپل جامعہ نعیمیہ) میاں مصطفیٰ صادق مدیر اعلیٰ روزنامہ وفاق وغیرہ تھے۔ کارروائی کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا، قاری امتیاز الرحمٰن تھانوی نے تلاوت فرمائی۔ اور نوجوان نعت خواں سلمان گیلانی نے ہدیۂ نعت بحضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پیش کیا۔ اس موقع پر حافظ فضل الرحیم سینئر نائب صدر رابطۂ ادب اسلامی، پاکستان نے پنجاب کے وزیر اعلیٰ صاحب کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا، جس میں انھوں نے وزیر اعلیٰ پنجاب کی اس نشست میں آمد پر ان کا شکریہ ادا

کرتے ہوئے عالمی رابطۂ ادب اسلامی کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی . . . . اس کے بعد تین قرار دایں بھی متفقہ طور پر منظور کی گئیں، جن میں سے پہلی قرار داد ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی (صدر شعبۂ عربی گورنمنٹ کالج فیصل آباد، دوسری ڈاکٹر ضیاء الحسن ندوی (دہلی) اور تیسری زاہد منیر عامر (لیکچرر شعبۂ اردو اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور) نے پیش کی، حاضرین نے ان کی توثیق فرمائی۔

اس کے بعد مولانا ابوالحسن علی ندوی نے خطاب فرمایا، انھوں نے پاکستان میں قائم عالمی رابطہ ادب اسلامی کے ارکان اور منتظمین کو اس سیمینار کی کامیابی پر مبارکباد دی اور اس سیمینار کو انتظامات کی عمدگی کے اعتبار سے ایک تاریخی سیمینار قرار دیا، صدر مجلس وزیر اعلیٰ پنجاب میاں محمد شہباز شریف کو چونکہ کسی اور تقریب میں جانا تھا، اس لیے انھوں نے اس موقع پر صدارتی خطبہ پڑھا، جس میں اُنہے عالمی رابطۂ ادب اسلامی کے اغراض و مقاصد کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیا اور اس میں شرکت کرنے والے اہل علم اور اہل قلم کو وقت کے فتنوں خصوصاً فرقہ پرستی کے خلاف جہاد کرنے کی دعوت دی اور اپنے اس عزم کا اعادہ کیا کہ ان کی حکومت فرقہ پرستی کے خلاف جنگ جاری رکھے گی۔ انھوں نے کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ علمائے کرام خود ساختہ حد بندیوں سے باہر نکلیں، اور اپنی اخلاقی، سیاسی اور فکری ذمہ داریوں کو محسوس کریں . . . . انھوں نے مزید کہا کہ اب جبکہ بیسویں صدی اختتام کو پہنچنے والی ہے، اور تمام دنیا ولولہ تازہ کے ساتھ اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی تیاریاں کررہی ہے، مسلم اُمّہ کو اپنی ذمہ داریوں سے غافل نہیں ہونا چاہیئے، انھوں نے کہا کہ علمائے کرام کے لیے کمپیوٹر سائنس کی تعلیم کا آغاز صحیح سمت میں ایک مثبت قدم ہے، انھوں نے مزید کہا کہ ہمیں اس حقیقت کو کبھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ قوموں کی زندگی اور ان کے عروج و زوال کا بہت گہرا تعلق علوم و فنون کی موزوں طریقے پر تعلیم و تدریس اور ان کی شبانہ روز محنت اور جد و جہد میں مضمر ہے اس لیے ہمیں اس میدان میں پورے اعتماد کے ساتھ اترنا چاہیئے۔

وزیر اعلیٰ پنجاب نے جامعہ اشرفیہ لاہور میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کے دفتر کے قیام اور وہاں حسن اکیڈمی آف ماڈرن لینگویجز اینڈ کمپیوٹر سائنسز کے افتتاح کو ایک اہم واقعہ قرار دیا اور دیگر علمی اور دینی اداروں کو بھی اس کی تقلید کرنے کی دعوت دی۔ اس کے بعد اجلاس

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی صدارت میں جاری رہا۔

اس موقع پر حیدر آباد سے آئے ہوئے مندوب اور سابق وفاقی وزیر برائے مذہبی امور جناب وصی مظہر ندوی نے تأثرات پیش کیے اور قطر کے مہمان ڈاکٹر خالد حسن ہنداوی نے عربی نظم پیش کی، جس میں انہوں نے اس سیمینار اور اس کی مختلف نشستوں کے متعلق خوبصورت طریقے پر اظہار خیال فرمایا۔ ان کی نظم کا اردو ترجمہ ڈاکٹر خالق داد (شعبۂ عربی اورینٹل کالج لاہور) نے پیش کیا۔ اس کے بعد مولانا علی میاں نے دعا کرائی اور اجلاس برخاست ہوگیا۔

یہاں سے تمام مندوبین جامعہ نعیمیہ پہنچے۔ یہاں مولانا ابوالحسن علی ندوی کی صدارت میں ایک مختصر تقریب ہوئی، جس کے بعد تمام مہمانوں نے کھانا کھایا۔ اس طرح بحمدللہ دو دنوں پر مشتمل یہ سیمینار مکمل ہوگیا..... فالحمدللہ علیٰ ذٰلک۔